Regd. L. No. 7243
Phone. 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ستمبر ۱۹۷۶

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء

شہدائے پاکستان
اس انتظار میں ہیں کہ ہم ان کے خون کی
قیمت کب ادا کرتے ہیں۔

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور
قیمت فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

قرآن مجید سمجھ میں نہیں آسکتا

⊙ ــــ ترجموں سے کیونکہ قرآنی الفاظ کے مرادفات دنیا کی کسی زبان میں نہیں مل سکتے۔

⊙ ــــ تفسیروں سے کیونکہ تفاسیر میں عام طور پر مفسرین کے اپنے خیالات اور معتقدات قرآنی مطالب پر غالب آجاتے ہیں۔

⊙ ــــ قرآن مجید اس طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ عربی مبین کی مستند کتب لغت کی رُو سے اس کے الفاظ کے معانی متعین کئے جائیں اور ایک مضمون کی مختلف آیات کو سامنے رکھ کر اس کا مفہوم مرتب کیا جائے۔

مفکرِ قرآن پرویز صاحب نے چالیس سال کی محنت شاقہ سے پہلے اس قسم کا ایک لغات مرتب کیا اور اسکے بعد پورے قرآن کا مفہوم اسی انداز سے متعین کیا ـــــ جو

مفہوم القرآن

کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔ قرآن فہمی کے سلسلہ میں اس کی مثال کہیں نہیں ملے گی۔

⊙ ــــ مفہوم القرآن (مع متن) موتیوں کی طرح ترشے ہوئے نستعلیق میں بلاکس کے ذریعے عمدہ سفید دبیز کاغذ پر چھاپا گیا ہے اور تین نہایت مضبوط خوبصورت سنہری جلدوں پر مشتمل ہے۔
ضخامت پندرہ سو صفحات۔

⊙ ...... قیمت: جلد اول پینتیس روپے (35/-) جلد دوم پینتیس روپے (35/-) جلد سوم چالیس روپے (40/-) مکمل سیٹ ایک سو دس روپے (110/-)

ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

ملنے کا پتہ

مکتبہ دین و دانش ـ چوک اردو بازار ـ لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلی فون	بدل اشتراک
۱ ۱/۲ ڈیڑھ روپیہ	۸۰۸۰۰	سالانہ
	خط و کتابت	پاکستان ـــ ۱۵ روپے
	ناظم ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/ بی گلبرگ ۲ لاہور	غیر ممالک ـــ ۲ پونڈ

شمارہ ۹	ستمبر ۱۹۷۵ء	جلد ۲۸

فہرست

۱۔ لمعات ــــــــــــــــ ۲

۲۔ حیاتِ قائدِ اعظمؒ کے نمایاں خط و خال ــــــــ ۹

۳۔ خود کو غلامی سے آزاد کر ــــــــ سعد حسن بشیر ــــــــ ۴۱

۴۔ نقد و نظر۔ تصوف کی خوں سامانیاں (انفاس العارفین) ــــــــ ۵۲

۵۔ مرگِ تو اہلِ جہاں را زندگیست ــــــــ ۵۹

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقامِ اشاعت ۲۵/ بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد۔ مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ۱۱۰ چوک انارکلی لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

اقوامِ مغرب کے اعصاب پر صدیوں تک شخصی حکومت کا عفریت اور نظامِ کلیسا (تھیاکریسی) کا بھوت سوار رہا۔ انھوں نے بالآخر تنگ آکر ان کے پنجۂ فولاد سے اپنے آپ کو چھڑایا تو ان کی جگہ ایک اور نظامِ حکومت کی طرح ڈالی، جسے انھوں نے جمہوریت کہہ کر پکارا۔ اس نظام کی پیدا کردہ خوش فہمیوں کی کیفیت یہ تھی کہ انھوں نے ساری دنیا میں ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا کہ ابنِ آدم جس جنت سے نکالا گیا تھا، انھوں نے اس کا سراغ پھر سے پا لیا ہے، اور اب انسانی اقتدار کے ہاتھوں کا ستایا ہوا انسان فردوسِ بداماں زندگی بسر کرے گا۔ جس میں یہ کسی کا محکوم نہیں ہوگا۔ جمہوریت وہ نظامِ حکومت ہے، جس میں سب مل کر اپنی مرضی اور منشا کے مطابق حکومت قائم کرتے ہیں۔ یہی وہ نظام ہے جس میں انسانیت حقیقی آزادی سے ہمکنار ہوگی۔

اقوامِ مغرب، اور ان کی اندھی تقلید میں دنیا کی دوسری قومیں، اس دریافت پر جشنِ مسرت منا رہی تھیں۔ لیکن خطۂ پنجاب کے ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا ایک دانشور، جس کی بصیرت نے قندیلِ آسمانی سے اکتسابِ ضیا کیا تھا، زیرِ لب مسکرا رہا تھا۔ جب اس سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو اس نے کہا کہ میں ان فریب خوردہ قوموں کی اس سادہ لوحی پر محوِ حیرت ہوں جو اتنا بھی نہیں سمجھتیں کہ ؎

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

اور اس کے بعد اس نے بآوازِ بلند کہا کہ ؎

اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تُو
آہ اے ناداں! قفس کو آشیاں سمجھا ہے تُو

سُننے والوں نے اسے سنا اور ایک شاعر کا تخیل کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ لیکن اس نئے نظام کا تجربہ کرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اس کے نتائج کو دیکھ کر خود مغرب کے اہلِ فکر و نظر چلّا اُٹھے اور انھوں نے پکار پکار کر کہنا شروع کر دیا کہ ہم پھر مبتلائے فریب ہو گئے۔ یہ نظام تو سابقہ نظاموں سے بھی زیادہ مستبد اور گلوگیر ہے۔ (مثلاً) لندن یونیورسٹی کے پروفیسر ایلفرڈ کوبن نے اپنی کتاب (THE CRISIS OF CIVILIZATION) میں نظامِ

جمہوریت پر کڑی تنقید کی اور بحث کو سمٹاتے ہوئے لکھا کہ :-

ہم اپنی دلیل کو دو فقروں میں سمیٹ دیتے ہیں۔ ڈیماکریسی کا اصول بتایا یہ جاتا ہے کہ اس میں اقتدارِ اعلیٰ عوام کو حاصل ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عمومی منشاء اپنا مستقل وجود رکھتا ہے۔ اس نظریہ کو صحیح تسلیم کرنے کا منطقی نتیجہ آمریت ہے۔ تاریخ شروع سے آخر تک یہی بتاتی ہے۔

پروفیسر کوہن کا مطلب یہ ہے کہ جسے عوام کا منشاء کہہ کر لوگوں کو فریب دیا جاتا ہے وہ درحقیقت برسرِ اقتدار طبقہ کی آمریت ہوتی ہے۔ اس میں جو شخص یا جو گروہ کسی طرح اکثریت حاصل کر لے اس کے اختیارات حدود فراموش ہو جاتے ہیں جنہیں کوئی طاقت چیلنج نہیں کر سکتی۔ اسی کو ڈکٹیٹرشپ یا آمریت کہا جاتا ہے۔ وہ اپنے اس نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

اس نظریہ کو اگر بنظرِ امعان دیکھا جائے تو "عوام کے اقتدارِ اعلیٰ" کا فریب نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ اگر سیاست کو نظری حیثیت سے نہیں عملی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ حاکم اور محکوم کو ایک ہی تصوّر کرنا عملی ناممکنات میں سے ہے۔ حاکم اور محکوم کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ یہ سمجھ لینا کہ دونوں ایک ہی ہیں۔ اسٹیٹ کو بدترین قسم کی آزادئ اختیارات دے دیتا ہے۔

انہی خطوط پر ایک اور مفکر (RENE GUENN) لکھتا ہے :-

اگر لفظِ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ خود اپنی حکومت آپ قائم کریں، تو یہ ایک ایسی چیز کا نام ہے جس کا وجود ناممکنات سے ہے، اور جو نہ کبھی پہلے وجود میں آئی ہے اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ ایسا کہنا ہی جمع بین النقیضین ہے کہ ایک ہی قوم بیک وقت حاکم بھی ہو اور محکوم بھی ..... حاکم اور محکوم کا تعلق دو الگ الگ عناصر کے وجود کا متقاضی ہے۔ اگر حاکم نہیں تو محکوم بھی نہیں۔ ہماری موجودہ دنیا میں جو لوگ کسی نہ کسی طرح قوت اور اقتدار حاصل کر لیتے ہیں، ان کی سب سے بڑی کامیابی اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں عقیدہ قائم کر دیں کہ ان پر کوئی حاکم نہیں، بلکہ وہ خود اپنے آپ پر حاکم ہیں۔ عام رائے دہندگی کا اصول اسی فریب دہی کی خاطر وضع کیا گیا ہے۔ اس اصول کی رُو سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ قانون، اکثریت کی مرضی سے وضع ہوتا ہے۔ اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اکثریت کی یہ مرضی ایک ایسی شے ہے جسے نہایت آسانی سے ایک خاص رُخ پر بھی لگایا جا سکتا ہے، اور بدلا بھی جا سکتا ہے۔

(THE CRISIS OF THE MODERN WORLD)

اسی طرح ایک اور مفکر (H. J. MENCKEN) کہتا ہے :-

تمام ناکامیوں میں سب سے بڑی ناکامی خود انسان کی ہے۔ اس انسان کی جو سب سے زیادہ مدنی الطبع

جیوان اور سب سے زیادہ عقل مند ہے۔ اور وہ ناکامی یہ ہے کہ یہ اپنے لئے آج تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکا جسے دُور سے بھی اچھی حکومت کہا جا سکے۔ اس نے اِس باب میں بڑی بڑی کوششیں کی ہیں۔ بہت سی ایسی جو فی الواقع حیرا العقول ہیں۔ اور بہت سی ایسی، جو بڑی جرأت آزما تھیں۔ لیکن جب ان کی عملاً تنفیذ کا وقت آیا تو نتیجہ حسرت و یاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ نظری طور پر حکومت کا خاکہ کھینچ لینا اور بات ہے اور عملی طور پر اسے نافذ کرنا اور بات۔ نظری طور پر حکومت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے اور اربابِ حکومت پبلک کے خادم ہیں۔ لیکن درحقیقت حکومت کا فریضہ پبلک کی خدمت نہیں، بلکہ سلب و نہب ہوتا ہے ..... اس باب میں مختلف اسالیبِ حکومت میں سب سے زیادہ ناکام نظام جمہوریت رہا ہے۔ جمہوری نظام کے اربابِ حل و عقد خوب جانتے ہیں کہ حکومت کی بنیاد معقولیت پر ہونی چاہیئے لیکن ان کا جذبۂ محرکہ کبھی معقولیت پسند نہیں ہوتا۔

(TREATISE ON RIGHT AND WRONG)

ہم چاہتے تو اِس باب میں مغربی مفکرین کی اور بھی بہت سی آرا پیش کر سکتے تھے۔ لیکن اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ اور وہ اس لئے کہ اس کی جو تازہ ترین عملی مثال ہمارے سامنے آئی ہے اس کے سامنے یہ نظری مثالیں کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔ ہندوستان کی حکومت کے متعلق دنیا کو یہ باور کرایا جاتا تھا کہ وہ جمہوریت کی بہترین مثال ہے۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ جمہوریت کی "مشینری" کے جتنے تقاضے تھے وہ وہاں پورے کر دیئے گئے تھے اور کسی پہلو سے بھی نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہاں جمہوری نظام نافذ نہیں۔ یہ فریب اسی طرح قائم رہتا، لیکن بدقسمتی سے وہاں کی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی کے انتخاب کے خلاف عذداری کے مقدمہ میں الہ آباد ہائی کورٹ کے ایک جج نے یہ فیصلہ دے دیا کہ مسز گاندھی سے اپنے انتخاب کے سلسلہ میں ایسے جرائم کا ارتکاب ہوا ہے، جن کی رُو سے اس کا انتخاب قانوناً جائز نہیں قرار دیا جا سکتا۔ چنانچہ اس کے انتخاب کو بھی کالعدم قرار دے دیا گیا اور کچھ عرصہ کے لئے جدید انتخابات کے لئے نااہل بھی (تفصیل اس کی طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت جولائی ۱۹۷۵ء کے لمعات میں گذر چکی ہے) پروفیسر کوہن نے جو کہا تھا کہ جمہوریت درحقیقت ایک نقاب ہوتا ہے۔ وہ ذرا سا بھی سرک جائے تو اس کے نیچے چھپی ہوئی آمریت نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ الہ آباد ہائی کورٹ کے اس فیصلہ نے جو اس نقاب کو ذرا سا سرکایا تو مسز اندرا گاندھی کی ڈکٹیٹر شپ بے حجابانہ سامنے آگئی۔ اس نے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر کے یہ اجازت لے لی کہ وہ تاصدورِ فیصلہ بدستور وزیراعظم رہے گی۔ جیسا کہ ابھی آپ کے سامنے آئے گا، یہ اجازت تو لی گئی نہایت معصومانہ انداز سے، لیکن اس کی تہہ میں ایک اور بڑا فریب پنہاں تھا۔ ملک میں ہنگامی حالات تو ایک عرصہ سے نافذ تھے، اس نے سب سے پہلے تمام خبروں پر سنسر بٹھا دیا۔ اخبارات کا گلا گھونٹ دیا۔ ملکی تو ایک طرف، بیرونی رپورٹرز تک کے لئے ایسے ناقابلِ تسلیم حالات پیدا کر دیئے کہ وہ ملک چھوڑ کر چلے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے حالات کے گرد آہنی دیواریں کھڑی ہو گئیں۔ اِدھر اُدھر سے جو خبریں آئیں ان کی رو سے پتہ چلا کہ پچھلے ماہ کے آخر تک پچاس ساٹھ ہزار کے قریب افراد پابندِ سلاسل کئے جا چکے ہیں۔ ان میں وہاں کے

ایسے ایسے ممتاز لیڈر بھی شامل ہیں جو مسز اندرا گاندھی کے والدِ بزرگوار سے بھی زیادہ قدآور اور جنگِ آزادی کے نامور ہیرو ہیں۔ ان سب کو جیلوں میں ٹھونس دیا گیا۔ ہائی کورٹ کے جس جج نے یہ وہ فیصلہ دیا تھا اُسے قتل کر دیا گیا۔ (نوائے وقت لاہور مورخہ ۱۳ اگست ۱۹۷۵ء) اس سے غالباً مقصد یہ تھا کہ سپریم کورٹ کے ججوں کو وارننگ مل جائے کہ مسز گاندھی کے خلاف فیصلہ دینے کا یہ انجام ہوگا۔ لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ یہ سب کچھ کر لینے کے باوجود مسز گاندھی کو اس کا احساس ہوا کہ یہ جج صاحبان شاید آزاد فیصلہ دے دیں۔ اس لئے اس نے مقدمہ کی سماعت سے دو تین دن ہی پہلے ایسا انتظام کر لیا کہ نہ وہ اس مقدمہ کی سماعت کر سکے اور نہ کوئی ایسا قانون اس پر لاگو ہو سکے جس سے یہ اپنے منصب پر برقرار نہ رہ سکے۔

ان حالات کو دیکھ کر ہر شخص یہی کہے گا کہ یہ بڑی دھاندلی ہے، بے انصافی ہے، لاقانونیت ہے، بے آئینی ہے۔ بدترین قسم کی ڈکٹیٹر شپ ہے، فرعونیت ہے، چنگیزیت ہے۔

لیکن نہیں، یہ ان میں سے کچھ بھی نہیں۔ یہ عین جمہوریت ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ یہ جمہوریت کس طرح ہے؟ اس طرح کہ پارلیمان کا ہنگامی اجلاس طلب کیا گیا اور اس میں ایسے قوانین منظور کرا لئے گئے جن کی رُو سے وزیرِ اعظم کی حیثیت ہر قسم کے قانون سے بالاتر قرار دیدی گئی۔ اور عدالتوں کے وہ تمام اختیارات سلب کر لئے گئے جن کی رُو سے وہ اس قسم کے مقدمات کی سماعت کی مجاز تھیں۔ اور ان تمام قوانین کو الٰہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلے سے پہلے کی تاریخوں میں نافذ العمل قرار دے دیا گیا۔ نظامِ جمہوریت کی رو سے پارلیمان کو ایسے قوانین منظور کرنے کا اختیار تھا اور پارلیمان میں مسز اندرا گاندھی کی پارٹی کی اتنی اکثریت ہے کہ اُس کے اجلاس میں جو کچھ بھی پیش ہو وہ بلا مزاحمت منظور ہو سکتا ہے۔ چنانچہ جب مسز گاندھی کے خلاف یہ اعتراض کیا گیا کہ اس نے دھاندلی مچا رکھی ہے تو اس نے نہایت سادگی سے کہہ دیا کہ اگر میں نے خلافِ جمہوریت کچھ کیا ہو تو میں ضرور قابلِ مواخذہ ہوں۔ آپ بتائیے کہ میں نے آئینِ جمہوریت کی کہاں خلاف ورزی کی ہے؟

یہ ہیں مغربی جمہوریت کے برگ و بار۔ یعنی، جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا ہے، اس نظام میں جو شخص بھی پارلیمان میں اکثریت حاصل کر لے، وہ ہر قسم کی فرعونیت کر سکتا ہے۔ اور اس پر کوئی شخص معترض نہیں ہو سکتا۔

یہ ہے وہ آخری نظام، جسے فکرِ انسانی وضع کر سکا ہے اور جسے جنتِ ارضی قرار دیا جاتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ اس کا علاج کیا ہے؟ اور اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا علاج ہے قرآن کا سیاسی نظام۔ اس نظام کی تفاصیل کتنی ہی طول طویل کیوں نہ ہوں، اس کے اساسی اصول نہایت مختصر ہیں۔ یعنی:-

(۱) اس کا (CONSTITUTION) کسی انسان کا مرتب کردہ نہیں، خدا کا عطا فرمودہ ہے۔ یعنی خدا کی کتاب۔

(۲) یہ (CONSTITUTION) ہر لحاظ سے مکمل ہے اور کسی کو حق حاصل نہیں کہ اس میں کسی قسم کا حک و اضافہ یا تغیر و تبدل کر سکے۔ (۶/۱۱۴)

(۳) اس کے احکام کا اطلاق تمام افراد پر یکساں ہوتا ہے اور بڑی سے بڑی شخصیت بھی اس سے مستثنیٰ قرار نہیں پا سکتی۔ چنانچہ اور تو اور، خود حضور رسالتمآبؐ نے بھی (ارشادِ خداوندی کی رُو سے) اعلان کر دیا کہ اگر میں بھی اس کی خلاف ورزی کروں تو اس کے مواخذہ سے نہیں بچ سکتا۔ (۱۰/۱۵)

(۴)۔ جو قانون بھی اس کے خلاف ہو اُسے آئینی سند حاصل نہیں ہو سکتی، کیونکہ خود اس آئین میں یہ شق موجود ہے
کہ جو شخص بھی اس کے مطابق فیصلہ نہیں کرے گا اُسے کافر قرار دیا جائے گا۔ (۵/۴۴)

(۵)۔ عدالتیں بھی اس کی پابند ہوں گی کہ وہ انہی قوانین کی رُو سے مقدمات کے فیصلے کریں جو اس آئین کے مطابق
ہوں۔ (۵/۴۸)

(۶)۔ اُمت کی مجلسِ مشاورت (پارلیمان) اس آئین کے اصولوں کو عملی شکل دینے کے لئے جزئی قوانین مرتب کرنے
کی مجاز ہو گی۔ لیکن ان قوانین کے اعلان سے پہلے سرزد شدہ کسی جرم پر ان کا اطلاق نہیں ہو گا۔ (۵/۹۵)

یہ ہیں مختصر الفاظ میں اسلامی نظام کے دستور کے اساسی اصول۔ جو شخص اس نظام کے دائرے میں داخل ہونا چاہے گا، اُسے یہ آئین دکھا دیا جائے گا۔ اگر وہ اِسے اپنے لئے قابلِ قبول سمجھے گا تو اس نظام کے تابع آجائے گا۔ اگر ایسا نہیں سمجھے گا تو وہ اس کے حدود سے باہر رہے گا۔ آپ سوچئے کہ جو شخص اس طرح اس دستور کو قبول کرے گا اُسے کس قدر محکم ضمانت حاصل ہو جائے گی کہ اگر میں نے اس آئین کی خلاف ورزی نہ کی تو کوئی بڑی سے بڑی قوت بھی میری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکے گی، نہ ہی اسے اس قسم کا خدشہ ہو گا کہ نہ معلوم کل کو اس دستور میں کیا کیا تبدیلیاں کر دی جائیں۔ اس لئے کہ یہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہے گا۔

غور کیجئے کہ اس آئین کے تابع آجانے والوں کی زندگی کس قدر خوف اور حزن سے مامون ہو جائے گی ۔۔ اور نہیں کس قدر قلبی اطمینان اور ذہنی سکون حاصل ہو گا۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآنی نظام اور فکرِ انسانی کے وضع کردہ نظاموں میں کیا فرق ہے۔ کیا فکرِ انسانی کا وضع کردہ کوئی نظام اس کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ کسی قوم کی اس سے بڑی ہرماں نصیبی اور بدبختی کیا ہو گی کہ وہ اس قسم کا آئین اپنے ہاں رکھتے ہوئے انسانوں کے وضع کردہ دساتیر کو اپنے لئے ضابطۂ حیات بنائے۔ اور اسی سے آپ اس کا بھی اندازہ لگا لیجئے کہ جو لوگ مغربی جمہوریت کو عین اسلام قرار دیتے ہیں وہ کس قدر فریب میں رہتے یا دوسروں کو فریب دیتے ہیں۔ مسلمانوں کی سیاست جمہوریت نہیں، قرآنی دستور ہے۔ لیکن اس حقیقت کو نہ مُلّا سمجھنے کے لئے تیار ہے نہ مسٹر۔

(۲) اسلامی مشاورتی کونسل کی مزید سفارشات

طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت اگست ۱۹۷۵ء میں اسلامی مشاورتی کونسل کی سفارشات کی قسطِ اوّل کو قِ قرطاس پر لایا گیا تھا۔ اس کے بعد اس کی چند ایک اور سفارشات اخبارات میں شائع ہوئی ہیں اور وہ یہ ہیں۔
(۱) ملک میں اسلامی نظامِ تعلیم رائج کیا جائے۔ (۲) عربی کی لازمی تعلیم۔ (۳) اسلامی تاریخ کی تعلیم۔ (۴) پرائمری درجوں میں اسکول اور مذہبی تعلیم کو یکجا کر دیا جائے۔ (۵) سرکاری ملازموں کی رپورٹ میں روزمرہ زندگی میں اسلامی احکامات کی پابندی سے متعلق اضافی خانہ۔ (۶) حکومت، تبلیغ کی ذمہ داری اپنے ذمہ لے۔ (۷) اخبارات کو اس سلسلہ میں استعمال کیا جائے۔ (۸) ریڈیو، ٹیلی ویژن سے اذان نشر کی جائے اور (۹) ربا کو ختم کر کے زکوٰۃ کے نظام قائم کیا جائے۔

(بحوالہ۔ المنبر ۶ اگست ۱۹۷۵ء)

ان سفارشات میں جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے وہ بڑے مقدس اور خوش آئند ہونے کے باوجود نئے نہیں۔ انہیں ہم گذشتہ پچیس چھبیس سال سے مسلسل سنتے چلے آرہے ہیں۔ لیکن ان پر عمل پیرا ہونا تو ایک طرف، ان کا مفہوم بھی آج تک متعین نہیں ہو سکا۔ مثلاً آج تک کسی نے یہ نہیں بتایا کہ اسلامی نظامِ تعلیم ہوتا کیا ہے۔ اگر وہ، وہی ہے جو اسکولوں اور کالجوں میں "اسلامیات" کے نام سے رائج ہے تو اس سے سیکولر نظامِ تعلیم کہیں بہتر ہے۔ اس تعلیم میں طالب علم صحیح اسلام سے بیگانہ تو رہتا ہے، لیکن اس سے متنفر نہیں ہوتا۔ اسلامیات دین سے نفرت اور اسلام سے برگشتگی پیدا کرنے کا نہایت مؤثر ذریعہ ہے۔ تجربہ اس کی شہادت دیتا ہے۔

یہی کیفیت اسلامی تاریخ کی ہے۔ اگر اسلامی تاریخ اُسی کا نام ہے جو "خلافت و ملوکیت" اور اسی جیسی دوسری کتابوں میں بیان کی جاتی ہے تو اس کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ خدا قوم کو اس کے شر سے محفوظ رکھے۔ یاد رکھئے! جو کچھ ہماری تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے ——— خواہ وہ متقدمین کی ہوں یا ان پر متفرع متاخرین کی، وہ ذہنوں میں اسلام کا رہا سہا تصور بھی ختم کر دینے کے لئے کافی ہے۔ جب تک آپ کم از کم صدرِ اوّل کی تاریخ قرآنِ کریم کی روشنی میں از سرِ نو مرتب نہیں کریں گے، آپ اسلام کی صحیح تصویر کبھی سامنے نہیں لا سکیں گے۔

جہاں تک تبلیغ کا تعلق ہے۔ آپ پہلے یہ تو متعین کیجئے کہ وہ اسلام ہے کونسا۔ جس کی تبلیغ کی ذمہ داری آپ حکومت پر عائد کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں ہر فرقہ کا اسلام الگ الگ ہے۔ اور الگ الگ ہی نہیں، ایک دوسرے سے ایسا متضاد اور متخالف کہ اس کی بنا پر اس کے علمبرداروں میں آئے دن سر پھٹول ہوتی رہتی ہے۔ یہی کیفیت ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے اذان کے نشر کرنے کی سفارش کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کونسی اذان اور وہ کس وقت نشر کی جائے گی؟ آپ کسی ایسے محلہ میں تشریف لے جائیے جہاں مختلف فرقوں کی مساجد اور ان کے میناروں پر لاؤڈ اسپیکر نصب ہوں۔ نمازوں میں مغرب کی نماز کا وقت سب سے مختصر ہوتا ہے۔ آپ دیکھئے کہ سُنّی اور شیعہ، اور پھر سُنّیوں میں اہلِ حدیث اور اہلِ فقہ کی اذانوں کے اوقات میں کس قدر فرق ہے ——— جہاں تک اذان کے الفاظ کا تعلق ہے، پہلے شیعوں اور سُنّیوں کی اذان میں فرق ہوتا تھا۔ اب خود سُنّیوں کی بعض مساجد سے ایسی اذان نشر ہونے لگ گئی ہے جس میں اذان سے پہلے ایسے الفاظ پکارے جاتے ہیں، جو خود سُنّیوں کے دوسرے فرقوں کی اذان میں نہیں ہوتے۔

سب سے اہم سفارش ربوٰ کو ختم کر کے زکوٰۃ کے نظام کا قائم کرنا ہے۔ اور یہی سفارش اہلِ فکر اصحاب کی توجہ کی زیادہ متقاضی ہے۔ ہمارے ہاں کیفیت یہ ہے کہ جب بھی معاشی نظام کا ذکر آتا ہے تو مذہبی حلقوں کی طرف سے یہ آواز بلند ہوتی ہے کہ اسلام کا خود ایک معاشی نظام ہے جو تمام اقتصادی مصائب کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ لیکن جس طرح آج تک سوشلزم کے مدعیوں نے یہ نہیں بتایا کہ سوشلزم کہتے کسے ہیں۔ یا سوشلزم اور اسلامی سوشلزم میں فرق کیا ہے۔ اسی طرح مذہبی حلقوں نے بھی کبھی یہ نہیں بتایا کہ اسلام کا وہ معاشی نظام ہے کیا جو تمام اقتصادی مسائل کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ سمٹ سمٹا کر یہ الفاظ بار بار دہرائے جائینگے کہ اس میں ربوٰ کو ختم ——— اور زکوٰۃ کے نظام کو رائج کیا جائے گا۔ اور لطف یہ کہ ان اصطلاحات کا مفہوم بھی آج تک کسی نے

نہیں بتایا۔ ربوٰا کا ترجمہ سود کر دیا جاتا ہے اور سود سے ذہن لامحالہ اس بیاج کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو سودی قرضوں پر ادا کیا جاتا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ سے ذہن اس اڑھائی فی صد کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، جسے سال کے بعد خیرات کے طور پر بانٹ دیا جاتا ہے۔ نظامِ زکوٰۃ سے عام مفہوم یہی لیا جاتا ہے کہ اس اڑھائی (یا کچھ اور فیصد) روپے کو منظم طور پر جمع کیا جائے اور اسے حکومت ان مصارف پر خرچ کرے جو قرآن میں مذکور ہیں۔ حالانکہ وہ مصارف بھی "صدقات" کے ہیں۔ زکوٰۃ کے نہیں۔

آج اسلام زمانے کی کسوٹی پر پرکھا جا رہا ہے۔ اور بغیر تو غیر، خود ہماری اپنی نئی نسل کے نوجوان (شاید آخری بار) یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ واقعی نوعِ انسان کی مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے یا ہم محض اپنے مقدس جذبات کی رُو سے بلا سوچے سمجھے ایسا کہتے چلے آ رہے ہیں۔ پاکستان وہ کسوٹی تھی جس پر اسے کسا جانا چاہیئے تھا۔ لیکن آج تک ایسا نہیں ہوا۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو یہ بڑا اہم موڑ ہے جس پر ہم اس وقت کھڑے ہیں اور بڑا ہی نازک مرحلہ ہے جس میں ہم قدم رکھنا چاہتے ہیں۔ اس وقت دنیا کی آنکھیں ہماری طرف لگی ہوئی ہیں، یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ اسلام کی مدعی مملکت کس قسم کا معاشی نظام پیش کرتی ہے۔ ہم اسلامی مشاورتی کونسل کے ذمہ دار ارکان سے باادب دریافت کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ کیا انہوں نے معاشیات سے متعلق تمام گوشوں کو سامنے رکھ کر اعداد و شمار کی رُو سے یہ دیکھ لیا ہے کہ ایسا نظام جزوی طور پر قائم کرنا ممکن بھی ہے جس میں ربوٰا کو ختم کر دیا جائے اور کیا اس کے ختم کرنے اور زکوٰۃ کا روپیہ حکومت کی زیرِ نگرانی اکٹھا کرنے سے وہ معاشی نظام قائم ہو جائے گا جو ہماری تمام اقتصادی مشکلات کا حل اپنے اندر رکھے گا؛ یہ اس لئے کہ اگر یہ نظام اس قسم کے نتائج پیدا نہ کر سکا، فلہٰذا ناکام رہا، تو یہ محض اسلامی مشاورتی کونسل کی کسی سفارش کی ناکامی نہیں ہوگی۔ دنیا اسے خود اسلام کی ناکامی تصور کرے گی۔ اور یہ اتنا بڑا نقصان ہوگا جس کی تلافی ناممکن ہو جائے گی ــــ کیا یہ سفارش کرتے وقت اسلامی مشاورتی کونسل نے اس عظیم ذمہ داری کے وزن کا صحیح صحیح اندازہ کر لیا ہے، یا محض حکومت کو "رپورٹ" بھیجنے کے فریضہ سے رسمی طور پر سبکدوش ہونے کی خاطر یہ الفاظ لکھ دیئے گئے ہیں.....؟

طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشن

بعونہٖ تعالےٰ اپنی درخشندہ روایات کے مطابق، آئندہ ماہ اکتوبر میں منعقد ہو رہی ہے۔ اس کی تاریخوں کا اعلان، مع پروگرام، آئندہ اشاعت میں کیا جائے گا۔ کنونشن کے کھلے اجلاس میں شرکت کی دعوتِ عام ہوتی ہے۔ ادارۂ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتب اور دیگر لٹریچر، کنونشن کے بک اسٹال پر موجود ہوتا ہے۔

(ناظمِ ادارہ طلوعِ اسلام)

آغازِ سخن بتقریب یومِ آزادی

حیاتِ قائدِ اعظمؒ

کے

(نمایاں خط و خال)

طلوعِ اسلام میں بار بار اس حقیقت کو نمایاں کیا گیا ہے کہ قوم کی انتہائی بدقسمتی ہے کہ آج تک نہ تو تحریکِ پاکستان کی مستند تاریخ مرتب ہوئی اور نہ ہی اس کے بانی قائد اعظمؒ کے سوانح حیات ہی مجتمع ہو سکے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ہماری قوم کا نوجوان طبقہ اس حقیقت سے قطعاً نا آشنا ہے کہ مطالبۂ پاکستان کے محرکات کیا تھے، اور اس کے حصول کے لئے قائد اعظمؒ کو کس قسم کی لڑائی لڑنی پڑی تھی۔ ان کوائف و حقائق کے مرتب و محفوظ شکل میں موجود نہ ہونے کا، وہ طبقہ بڑا ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔ جو اپنا فائدہ اسی میں دیکھتا ہے کہ یہ، موجودہ اور آنے والی نسلوں کی نگاہوں سے اوجھل رہیں۔ اس سلسلہ میں وہ بھانت بھانت کی بولیاں بولتا اور طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلاتا رہتا ہے۔ اس صورتِ حالات سے متاثر ہو کر ہمارے قارئین کی طرف سے اکثر تقاضا ہوتا رہتا ہے کہ اس سلسلہ میں طلوعِ اسلام ہی کوئی قدم اٹھائے۔ طلوعِ اسلام میں تحریکِ پاکستان کے تعارف کے ضمن میں تو اکثر و بیشتر لکھا جاتا ہے، لیکن قائد اعظمؒ کی کتابِ زندگی کے بارے میں بلاواسطہ بہت کم لکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مقصد کے لئے جس (MATERIAL) کی ضرورت ہے، وہ نہ تو طلوعِ اسلام کے ہاں موجود ہے اور نہ ہی اس تک اس کی رسائی ہے۔ بایں ہمہ قارئین کی بے تابیٔ تمنا کی کسی حد تک تسکین کے لئے ہم اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ حیاتِ قائدِ اعظمؒ کے کچھ نمایاں خط و خال پیش کر دیئے جائیں جن سے ان کی سیرت و کردار کا اجمالی سا تصور سامنے آ جائے۔ اس ضمن میں ہم نے ۱۹۶۰ء میں ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا تھا جو بیشتر ان واقعات پر مبنی تھا جو طلوعِ اسلام کے دورِ اوّل کے فائلوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ چونکہ اس بات کو بھی اب قریب پندرہ سال کا عرصہ گذر چکا ہے اور اس دوران میں قارئین کے حلقہ میں معتدبہ اضافہ اور تبدیلیاں ہو گئی ہیں، اس لئے

ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس سلسلۂ مضامین کو بعد نظرِ ثانی از سرِ نو پیش کر دیا جائے۔ اس کا آغاز ۱۹۷۵ء کے یومِ آزادی کی نسبت سے کیا جاتا ہے۔ امید ہے قارئین اس سلسلہ کو مفید پائیں گے۔

☆

(قسط اوّل)

کم و بیش پینتیس سال قبل ——— ۲۳ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کا آفتاب ایک عظیم صبحِ انقلاب کا نقیب بن کر چالیس کروڑ انسانوں کے افقِ تقدیر پر طلوع ہو رہا تھا۔ وقت اور حالات کا قافلہ ایک نیا موڑ مڑ رہا تھا۔ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد تاریخ کا ایک نیا ورق الٹ رہی تھی اور مؤرخ کا قلم ایک نئے باب کا عنوان باندھ رہا تھا۔ ایک طرف یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور دوسری جانب دریائے راوی کے کنارے دس لاکھ انسان اس قومی عزم کو سینوں میں لئے جمع تھے کہ تاریخ کا رُخ موڑ دیں اور صدیوں کے قومی زوال اور شکست کی تاریکیوں سے ایک نئی صبحِ بہار کا عنوان پیدا کریں۔ منٹو پارک کے اس عظیم الشان قومی دربار میں ایک مغنیٔ آتش نفس کی آواز گونج رہی تھی ؎

ملّت کا پاسباں ہے محمد علی جناح　　ملّت کا جسمِ جاں ہے محمد علی جناح

اور قومی دربار کا ہر فرد محسوس کر رہا تھا کہ ان کے خلوص بھرے جذبات و احساسات کی اس سے بہتر ترجمانی ممکن نہیں، اور پھر جب اسی نے کہا کہ ؎

لگتا ہے ٹھیک جا کے نشانے پہ جس کا تیر　　ایسی کڑی کماں ہے محمد علی جناح

تو قائدِ اعظم زندہ باد کے گردوں شگاف نعرے والہانہ شہادت کے امین بن کر فضا میں گونج اٹھے۔ سب کی نگاہیں مسندِ صدارت پر مرکوز ہو گئیں۔

آتش نوائی کا یہ سلسلہ آگے بڑھا ؎

غیروں کے دل بھی سینوں کے اندر دہل گئے　　تقدیر کی اذاں ہے محمد علی جناح

تاریخ کی ایک لازوال حقیقت ان الفاظ کی پہنائیوں میں رقص کر رہی تھی۔ راوی کے کنارے جھوم اٹھے۔ شاہی مسجد کے مینار وجد میں آ گئے اور ان کے سائے میں سونے والے مردِ قلندر کی روح پکار اٹھی!

مرغِ چمن! ہے یہی تیری نواؤں کا صلہ

مسندِ صدارت پر رونق افروز قائدِ اعظم کی پلکوں پہ انتہائی ضبط کے باوجود قطراتِ اشک تیرنے لگے۔

گردشِ لیل و نہار برق رفتاریوں سے تاریخ کے کئی کٹھن مرحلے طے کر گئی۔ ملّتِ پاکستان کا کاروانِ عزم و ہمت دشوار گذار راہوں کو پامال کرتا ہوا یہاں تک آ پہنچا۔ پینتیس سال کی یہ مدت اپنے شب و روز کے جلو میں تیزی سے گذر گئی۔ لیکن تاریخ کے اس نقشِ تابندہ کی آب و تاب آج بھی بعینہٖ شادابیٔ قلب و نظر کا وہ سامان پیدا کر رہی ہے، جسے وقت کی رفتار متاثر نہیں کر سکی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا یہی تاریخی اجلاس تھا جس نے محمد علی جناح کی صدارت میں قراردادِ پاکستان کے نام پر اپنی قومی منزل کا تعین کیا اور پھر اسی دور اندیش قافلہ سالار کی قیادت میں ہماری قوم نے اس کٹھن منزل کو سات سال کی مختصر مدت میں اس فاتحانہ شان سے طے کیا کہ آج مؤرخ کے لئے پاکستان اور قائدِ اعظم

کے مابین حدِ فاصل یا خطِ امتیاز قائم کرنا ممکن نہیں رہا۔ یہی گراں مایہ قیادت تھی جس نے پاکستان کے قومی نصب العین پر مہرِ تصدیق ثبت کی اور پھر ملّت کے قدم اس حسنِ تدبر سے نصب العین کی طرف بڑھاتی چلی گئی کہ ایک ایک سنگِ میل نے زبانِ حال سے شہادت دی کہ محمد علی جناح ہماری ملّت کا پاسبان بھی تھا اور اس کے سینے میں مچلتی ہوئی رُوح بھی۔ نہ صرف یہ کہ اس کا ہر تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا بلکہ اس نے اپنے حریفوں کے دلوں میں قدم قدم پر ایک زلزلہ بھی پیدا کئے رکھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے اٹل فیصلے بالآخر تقدیر کی اذان ثابت ہوئے اور اس نے صفحۂ قرطاس پر جو لکیریں کھینچ دیں وہ اس برصغیر کی تقسیم کا مستقل عنوان اور چالیس کروڑ انسانوں کی تقدیر کا آخری فیصلہ قرار پا گئیں۔

ہماری تاریخ کا یہ ایک خوشگوار اور خوش آئند انقلاب تھا جس نے نہ صرف غیر ملکی سامراج کے بندھن توڑ کر رکھ دیئے بلکہ برادرانِ وطن کی رام راج کی سازشوں کا تار و پود بکھیر کر ہمیں ایک آزاد اور خود مختار مملکت کی نعمتِ عظمےٰ سے بھی مالا مال کر دیا۔ کیا یہ اسی دیدہ ور کے حسنِ تدبر اور ملکہ فراست کا شاہکار نہیں کہ آج ہمیں ایک آزاد مملکت کے آزاد شہری بننے کا شرف حاصل ہے یا اسی عظیم اور لازوال تاریخی حقیقت کا روح نواز احساس ہے جس نے آج ہمیں اس سعادت سے بہرہ ور کیا ہے کہ ہم اس بلند و بالا شخصیت کے آستانۂ عظمت پر تحسین و تبریک کی نذرِ بیانہ نذر پیش کریں اور اس کے تدبر اور فراست کے ان زندہ جاوید کارناموں کو منظرِ اشاعت پر لائیں، جن کے صدقے میں ایک مایوس اور شکست خوردہ قوم موت کی ہچکیوں سے نجات پا کر عروج و اقبال، آزادی و استقلال اور حکومت و سلطنت کی وارث قرار پا گئی۔

یورپ کے شہرۂ آفاق صحافی بیورلی نکلس نے انتہائی یقین و اعتماد سے اسے "ایشیا کا اہم ترین انسان" قرار دیا تھا اور آج جب ہم اس کی کتابِ زندگی کے اوراق الٹ رہے ہیں تو ہمارا دل یقیناً اس حقیقت سے سرشار ہے کہ جہاں وہ ہماری ملّت کا محبوب قائدِ اعظم تھا وہاں اغیار کے انصاف پسند حلقوں میں اسے "ایشیا کے اہم ترین انسان" کا منصبِ جلیل بھی حاصل تھا۔ حقیقت پسند بیورلی نکلس کی معدبین نگاہیں قیامِ پاکستان سے چار سال قبل (۱۹۴۳ء میں) پردۂ تقدیر سے کیا کچھ ابھرتے دیکھ رہی تھیں۔ یہ جاننے کے لئے اس کی شہرۂ آفاق کتاب "ورڈکٹ آن انڈیا" کے ان الفاظ پر غور کیجئے۔

> ہندوستان بلاشبہ چند ہی سال میں دنیا کا اہم ترین مسئلہ بن جائے گا۔ اور مسٹر جناح اس باب میں عدیم النظیر نازک اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق جس طرف چاہیں جنگ کا رُخ موڑ سکتے ہیں۔ دس کروڑ انسان ان کی چشم و ابرو کے اشارے پر حرکت میں آنے کے لئے کمربستہ ہیں۔ یہ مقام کسی اور کو حاصل نہیں۔ ہندو حلقوں میں بھی یہ بات نہیں۔

یہ ہے عظمتِ قائد کا ایک تابندہ نقش ـــــ ان ہزاروں زندہ جاوید نقوش میں سے جن کی تابناکیوں سے پوری تحریکِ پاکستان اور اس کا پس منظر جگمگا رہا ہے۔ اس نے یکساں طور پر اپنوں اور بیگانوں کے دلوں پر اپنی عظمت کا سکہ بٹھایا اور سب نے برملا اس کے اوصاف و کمالات کی زبانِ حال سے پکار پکار شہادت دی۔

حیاتِ قائد کی ان تعارفی تفاصیل میں حسنِ ترتیب اور ربطِ باہمی کا تقاضا ہے کہ سب سے پہلے ہم ان کی کتابِ زندگی

کا ایک مختصر سا جائزہ مجموعی طور پر پیش کر دیں۔ اور اس کے بعد آئندہ اشاعتوں میں ان کی زندگی کا ہر گوشہ تفصیلاً قارئین کے سامنے آتا رہے۔

قلمی خاکہ

قائدِ اعظمؒ کی پُراثر شخصیت کے ذہن میں اُبھرتے ہی تاریخ چشمِ تصوّر کے سامنے ایک نحیف و نزار لیکن بہترین انگریزی لباس میں ملبوس "مردِ مشرق" کو لاکر کھڑا کر دیتی ہے۔ مانٹیگو چمسفورڈ اسکیم کے سلسلہ میں وزیرِ ہند مسٹر مانٹیگو ہندوستان کے دورے پر تشریف لاتے ہیں اور اس دور کے چوٹی کے لیڈروں ——— تلک، گوکھلے، دادا بھائی نوروجی وغیرہم ——— سے ملاقات کرتے ہیں اور ساتھ ہی چونتیس ۳۴ سالہ خوبصورت جناح سے بھی۔ (یہ ۱۹۱۸ء کا قصہ ہے) اور پھر وہ اپنی ڈائری میں اس جواں سال اور پختہ کار سیاستدان کے متعلق اپنے تاثرات قلمبند کرتے ہوئے لکھتے ہیں ———

> ایک صاف ستھرا، انتہائی باسلیقہ نوجوان جس کی چال ڈھال دل پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ گفتگو میں منطقی، داؤ پیچ کا زبردست ماہر۔ اپنی بات کو سولہ آنے منوانے کا مدعی، وہ اپنی رائے میں کسی ترمیم کا روادار نہیں۔ اگر اس کی پوری بات نہ مانی جائے تو آدھی بات ماننے پر کبھی راضی نہیں ہوگا۔ میں اس سے باتیں کر کے ہار گیا۔ لارڈ چمسفورڈ نے اس سے بحث کرنے کی کوشش کی، لیکن جناح کی قوتِ استدلال نے اسے پوری طرح الجھا کر چاروں شانے چت گرا دیا۔ وہ ایک انتہائی ذہین شخصیت کا مالک ہے اور اس سے بڑھ کر حقوق کی پامالی اور کیا ہو سکتی ہے کہ جناح جیسے انسان کو بھی نظامِ مملکت میں دخل حاصل نہ ہو۔

ہیورلی نکلس اس سے ملاقات کے بعد اس کی عظمت کا خاکہ کھینچتا ہوا لکھتا ہے:۔

> دراز قد، چھریرا بدن، وضع دار، سلک سوٹ زیبِ تن کئے ہوئے اور ایک چشمی عینک لگی ہوئی۔ ایک سفید کالر گلے میں، جسے وہ شدید گرمیوں میں استعمال کرنے کا عادی ہے۔ وہ شرفائے ہسپانیہ کی طرح نظر آتا ہے۔ سیاسی مسلک میں کہنہ مشق مدبر۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی باعظمت شخصیت سینٹ جیمس کلب میں رونق افروز کوئی لطیف سا مشروب نوش جان کر رہی اور جریدہ "ٹی ٹیمز" کے مطالعہ میں مصروف ہو۔

(VERDICT ON INDIA)

طفولیت کی وادیوں سے کارگہِ شباب کی طرف

یہ تھا وہ قائدِ اعظمؒ جس نے ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو نیو نہم روڈ کراچی کے "وزیر مینشن" میں جنم لیا۔ حسنِ اتفاق کی کرشمہ سازیاں دیکھئے کہ جب ستر برس بعد، قائدِ اعظم کے حسنِ تدبر کا شاہکار ایک عظیم اسلامی مملکت کی صورت میں منصۂ شہود پر آیا تو ان کے اسی مولد کو اس مملکتِ نو کا دارالسلطنت بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ جہاں انہوں نے میدانِ حیات میں آنکھ کھولی۔ جہاں کے "سندھ مدرسۃ الاسلام" میں انھوں نے "بغدادی قاعدہ" اور عربی و فارسی کی چند کتابیں پڑھیں اور پھر ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بمبئی یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان امتیازی شان سے پاس کرنے کے قابل ہو گئے۔

اس مدت میں اس ہونہار طالب علم کی ذہانت و فطانت کے کرشمے اعزا و احباب کے حلقے میں جگمگا اٹھے تھے اور اپنے خاندان کے ایک مخلص دوست سر فریڈرک کرائٹ کے مشورے پر سولہ سال کی عمر میں یہ سلجھا ہوا نوجوان بیرسٹری کی تعلیم کے لئے عازم انگلستان ہو رہا تھا۔ لاریب کہ اس نے "لنکن اِن" سے بڑے امتیاز کے ساتھ بیرسٹری کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ لیکن دورانِ تعلیم وہ اسی ایک مقصد پر مطمئن ہو کر نہیں بیٹھا۔ طالب علمی میں وہ زیادہ وقت ہاؤس آف پارلیمنٹ میں برطانوی مدبرین کی تقریریں سننے کے لئے وقف کرتا۔ انہیں لبرل پارٹی کے مکتبِ فکر سے بالخصوص وابستگی تھی اور اس مکتب کے ممتاز قائدین سے انھوں نے رابطہ بھی قائم کیا۔ آئرش ہوم رول کی تحریک کے سلسلہ میں عظیم سیاست داں مسٹر گلیڈسٹون کی پُرجوش تقریریں ان کے ذوقِ سیاست کا مرکز بنی رہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لیبر پارٹی بڑی تیزی سے برطانوی عوام کی ہمنوائی سے اقتدار کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ہر چہار اطراف آزادیٔ نسواں کے چرچے تھے، اور ہندوستان سے ہمدردی کا جذبہ بڑی تیزی سے ابھر رہا تھا۔ ہونہار، دوراندیش اور بیدار مغز جناح کا اس ماحول سے متاثر ہونا قدرتی تھا۔ استخلاصِ وطن کے مخلصانہ جذبات نے ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھر کر قلب و نظر کو کافی سرشار کر رکھا تھا۔ عین اس مرحلہ پر انگلستان میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے ان کے جذبات و احساسات میں ایک تہلکہ سا مچا دیا۔ ہندوستان کے برگزیدہ راہنما دادا بھائی نوروجی ان دنوں اپنے سیاسی مشن کے تحت انگلستان میں قیام پذیر تھے۔ ہر ہندوستانی انہیں قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور جناح تو یوں سمجھئے گویا انہیں اپنا "سیاسی استاد" تصور کرتے تھے۔ برطانوی وزیراعظم لارڈ سالسبری کو دادا بھائی نوروجی سے ایک سیاسی کد سی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ایک تقریر میں اس محترم ہندوستانی راہنما کو "کالا آدمی" کہہ کر ان کا مضحکہ اڑایا۔ لارڈ سالسبری کے یہ توہین آمیز الفاظ یورپ میں مقیم ہندوستانی طالب علموں کے لئے وجۂ اشتعال ثابت ہوئے۔ انھوں نے اس اہانت آمیز چیلنج کا منہ توڑ جواب دینے کے لئے دادا بھائی نوروجی کو ایک حلقۂ انتخاب سے پارلیمنٹ کے لئے امیدوار کھڑا کر دیا اور جم ٹھونک کر میدان میں آ گئے۔ ایم اے جناح اور سی آر داس ہندوستانی طلباء کی اس مہم کی قیادت کر رہے تھے۔

بیرسٹری کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد یہ گرم جوش لیکن سلجھا ہوا نوجوان ۱۸۹۶ء میں اپنے وطن واپس لوٹتا ہے اور واپس پہنچ کر دیکھتا ہے کہ ان کے والد محترم کا کاروبار تباہ ہو چکا ہے اور پورا خاندان مالی مشکلات سے بُری طرح دوچار ہے۔ حالات بے حد دگرگوں تھے۔ چاروں طرف مایوسیوں کا دور دورہ تھا۔ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو ان مایوسیوں کا شکار ہو کر رہ جاتا اور ابتلا و آزمائش کے اس طوفان سے شکست کھا کر اپنے آپ کو گوشۂ گمنامی کے سپرد کر دیتا لیکن جناح کے سینے میں فولاد کا دل تھا۔ وہ وقت اور حالات کے جانکاہ تھپیڑوں سے نبرد آزمائی کے لئے پیدا ہوا تھا۔ اس نے طوفان سے کھیلنا اور ستاروں پر کمندیں ڈالنا سیکھا تھا۔ اس نے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کا عزم کر لیا اور سب کے مشوروں کو ٹھکرا کر کراچی کے بجائے بمبئی کے ہنگامہ کارزار میں پہنچ گیا۔

کامرانیاں قدم چومتی ہیں

بمبئی کے ابتدائی تین سال بڑے ہی کٹھن مرحلوں میں طے ہوئے۔ اتنے بڑے شہر میں بے یار و مددگار نوجوان کے لئے جس کی زندگی آسائشوں سے مالا مال تھی۔ نت نئی پریشانیوں، مایوسیوں، تلخیوں کا سامنا تھا۔ قدم قدم پر ٹھوکریں ہی ٹھوکریں تھیں۔ لیکن جناح ان انسانوں سے مختلف تھے جو زندگی کی کڑی آزمائشوں میں احساسِ بے چارگی سے دب کر رہ جاتے ہیں۔ ان کا سینہ ایک مردِ خود آگاہ کے

عزم بلند سے معمور تھا۔ وہ ہمت و جرأت کے ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ اس کے دل میں کوہ پاس ولولوں کی آگ سی سلگ رہی تھی۔ وہ ان تمام مصائب و مشکلات سے مردانہ وار نبرد آزما رہے اور بالآخر سب کو شکست فاش دیکر ممکنات زندگی کی وہ راہیں ہموار کرلیں جہاں منزلیں قدم لینے کو آگے بڑھتی ہیں اور فتح و کامرانی کا ابر بہار سر پر سایہ فگن ہو جاتا ہے۔

تیس سال بعد جب یکایک ابتلاؤں کی تاریکیاں چھٹیں تو بمبئی کے پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی مسند اعزاز اس پچیس سالہ نوجوان کا خیر مقدم کر رہی تھی۔ اب انہیں اپنے حالات سنوارنے کا سنہری موقع میسر آتا ہے۔ لیکن ترقی پسند جناح زیادہ دیر تک اس منصب پر قناعت نہیں کرتے۔ اور جب عدلیہ کے انچارج سر چارلس اولیونٹ پندرہ سو روپے ماہوار مشاہرہ پر یہ عارضی منصب انہیں مستقل طور پر پیش کرتے ہیں تو مسٹر جناح شکریہ کے ساتھ یہ کہتے ہوئے اس پیش کش کو مسترد کر دیتے ہیں کہ "میں کم سے کم پندرہ سو روپے روزانہ کمانے کا پروگرام بنا چکا ہوں"۔ سر چارلس اسے مجذوب کی بڑ سمجھ کر مشکل اپنے طنزیہ تبصرے کو ضبط کرتے ہیں۔ لیکن بہت جلد وہ بڑی حیرت سے سنتے ہیں کہ اس نوجوان کی پریکٹس واقعی پندرہ سو روپے روزانہ سے زیادہ ہے۔

پارلیمانی اور عملی سیاسیات کے کارزار میں

جناح اب بمبئی کے ایک کامیاب بیرسٹر ہیں، چاروں طرف ان کی قانون دانی کی دھوم مچی ہے۔ وہ مشکلات و موانعات کے چکر سے نجات حاصل کر چکے ہیں۔ انہیں زندگی کی تمام سہولتیں اور فراغتیں میسر ہیں۔ چنانچہ ان کا قدم ملکی سیاسیات کی خارزار وادیوں کی طرف بڑھتا ہے۔ وہ سب سے پہلے ۱۹۰۵ء میں دادا بھائی نوروجی کے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے آل انڈیا نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس کلکتہ میں شریک ہوتے ہیں۔ پھر سپریم امپیریل کونسل کے انتخاب میں بلا مقابلہ کامیاب ہونے کا سہرا ان کے سر بندھتا ہے۔ ۱۹۱۳ء میں وہ بغرض تفریح عازم انگلستان ہو جاتے ہیں۔ وہیں ہندوستانی طلباء کی "سنٹرل ایسوسی ایشن" کا سنگ بنیاد رکھتے ہیں اور وہیں سروزیر حسن کی پرخلوص دعوت پر پہلی بار آل انڈیا مسلم لیگ کی باضابطہ رکنیت قبول کرتے ہیں۔ مئی ۱۹۱۴ء میں وہ ایک بار پھر انڈیا کونسل کی اصلاح کے سلسلے میں کانگریس کے نمائندے بن کر انگلستان جاتے ہیں اور ہندوستانی طلباء اور ہندوستان دوست انگریزوں کی طرف سے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ قیام انگلستان کے دوران وہ انتہائی جرأت، صاف گوئی، اور قوت استدلال سے ہندوستان کا نقطۂ نظر انڈیا کونسل کے متعلق برطانوی مدبرین کے سامنے پیش کرتے ہیں اور واضح کرتے ہیں کہ جس کونسل میں ہندوستان کو حقیقی نمائندگی حاصل نہ ہو وہ مفید نتائج پیدا کرنے کی اہل قطعاً نہیں۔

ہندو مسلم اتحاد کا طائر پیش رس

اس حقیقت کو پیش نظر رکھیئے کہ جناح کی سیاسی زندگی کا یہ دور ہندو مسلم اتحاد کی شبانہ روز کوششوں کا ایک مستقل باب ہے۔ کانگریس کے ساتھ مسلم لیگ میں ان کی شمولیت بھی اسی احساس کی مظہر تھی۔ ۱۹۱۰ء میں الہ آباد کی ہندو مسلم کانفرنس ان کی انہی مساعی کا نشان اور اسی شریف ترین جذبہ کی آئینہ دار تھی۔ اس کانفرنس میں ملک کے چوٹی کے زعماء شریک ہوتے ہیں اور جناح اس کانفرنس کے روح رواں ہیں۔ بدقسمتی سے یہ تاریخی کانفرنس ناکامی پر منتج ہوتی ہے۔ بڑے

بڑوں کے دل مایوسیوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ لیکن جناح ان ناکامیوں کا ادنیٰ اثر قبول کئے بغیر پورے عزم و ہمت سے اس خارزار میں رواں دواں آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ اور چھ سال بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا عزم و استقلال فتح مندی سے ہمکنار ہوتا ہے اور "میثاق لکھنؤ" کے نام سے ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنما ہندو مسلم اتحاد کے فارمولے پر بالاتفاق جو ہرنقطہ پر متفق ثبت کر دیتے ہیں۔ ملکی سیاسیات میں جناح کی مساعئ جمیلہ کا یہ پہلا شاہکار تھا اور اس کے بعد ہر دو قومیں انہیں "سفیر اتحاد" کے خطاب سے یاد کرتی ہیں۔

ہوم رول لیگ کی تحریک

ہندو مسلم اتحاد کی اس تحریک کو شعوری طور پر آگے بڑھانے اور سیلف گورنمنٹ کی منزل تک پہنچنے کے لئے مسز اینی بسنٹ، نے ہوم رول لیگ کی تنظیم کی اور جب اس نے عوام کے ذہنوں تک رسائی حاصل کرنے کی جدوجہد کا آغاز کیا تو جناح کو بھی دعوت دی گئی کہ اس پلیٹ فارم سے ہوم رول تحریک کی راہ نمائی کریں۔ جناح ادنیٰ پس و پیش کئے بغیر آگے بڑھے، ان گرم جوشیوں سے تھوڑی ہی مدت میں اس تحریک کا پلیٹ فارم استخلاص وطن کی جدوجہد کا موثر ترین پلیٹ فارم بن گیا اور اس کی گونج سات ہزار میل دور ویسٹ منسٹر ہال تک کی فضاؤں میں زلزلہ انداز ہونے لگی۔ اسی فلک رس آواز کا اثر تھا کہ لارڈ ہارڈنگ نے برطانوی پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے انگریزوں اور ہندوستانیوں کو مشترکہ دعوت دی کہ وہ ان کے دورِ حکومت پر پوری آزادی سے تبصرہ کریں، جناح اس دعوت کو لبیک کہتے ہوئے مردانہ وار آگے بڑھے اور ہوم رول لیگ کے پلیٹ فارم سے جوابی تقریر کرتے ہوئے پہلے وائسرائے بہادر کی فراخدلی کا اعتراف کیا اور پھر جنگ عظیم میں اہلِ ہند کی بے مثال قربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے دوٹوک الفاظ میں کہا۔

> ان قربانیوں کے باوجود ہندوستان سے کیا سلوک روا رکھا جا رہا ہے؟ باوجود انسانی خون گرانے کے ہندوستان کو اس کی قیمت کیا مل رہی ہے؟ کیا ان قربانیوں کا یہی صلہ ہے کہ آزادی کے علمبردار جیلوں میں بند کئے جا رہے ہیں۔ آخر قربانیوں کا زبانی اعتراف کر لینے سے کیا ہوتا ہے...... یہ جنگ آزادی اور استقلال کی بقا کے لئے لڑی گئی تھی۔ کیا دفتری حکومت اندھی تھی؟ کیا اربابِ حکومت فاتر العقل تھے جو جنگ جیتنے کے بعد ہندوستانیوں سے ایسا سلوک روا رکھنے پر اتر آئے؟ یاد رکھئے کہ یہ طرزِ حکومت کے ذہنی اور سیاسی افلاس کا نشان ہے۔
>
> (قائداعظم محمد علی جناح)

جناح کے انہیں نعرہ ہائے حریت کا اثر تھا کہ ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو وزیر ہند نے دارالعوام میں اعلان کیا کہ —

> ملک معظم کی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو انتظامی معاملات میں زیادہ سے زیادہ مواقع دیئے جائیں۔ اور رفتہ رفتہ حکومت برطانیہ کے اس حصہ میں سیلف گورنمنٹ کی بنیاد رکھی جائے۔
>
> (قائداعظم محمد علی جناح)

وزیر ہند مسٹر مانٹیگو اس اعلان کے بعد خود ہندوستان میں تشریف لائے۔ انہوں نے یہاں چوٹی کے سیاسی رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں اور بالآخر اس کا نتیجہ مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم کی اصلاحات کی صورت میں منظرِ عام پر آیا۔

استعمار پسندوں سے ٹکراؤ

لیکن اس وقت جبکہ وزیر ہند مسٹر مانٹیگو اور وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ ہندوستان کو مطمئن کرنے کی جدوجہد میں سرگرم کار تھے، حکومتِ ہند میں ایسے استعمار پرست انگریز حکمران بھی موجود تھے۔ جن کے دلوں میں ہندوستانیوں کے خلاف نفرت و حقارت کی آگ سلگ رہی تھی۔ انسانی آزادی اور حریت کے یہ ازلی دشمن کسی قیمت پر یہ گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں تھے کہ اس بدنصیب ملک کی غلامی کی زنجیریں ٹوٹنے پائیں۔ لارڈ سڈنہم اور لارڈ ولنگڈن جو یکے بعد دیگرے بمبئی کے گورنر مقرر ہوئے اپنی مذموم سازشوں کی بنا پر اس طائفہ میں سب سے پیش پیش تھے۔ جناح اس وقت آزادی کے ہیرو اور ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی آنکھ کا تارا شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے کچھ دیر امپیریلزم کے ان بدمستوں کی کارستانیوں کا جائزہ لیا اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ جواں سال اور جواں بخت ہیرو انتہائی جرأت و بے باکی سے ان پر ٹوٹ پڑتا ہے۔

لارڈ سڈنہم کے خلاف ہوم رول لیگ کے پلیٹ فارم سے اس کی آواز پوری قوت سے گونجتی ہے۔

> یہی ہے وہ رجعت پسند جو ایک عرصہ دراز تک ہندوستان کی مہمان نوازی سے لطف اندوز رہا۔ جس نے ہندوستان کے خزانے سے بیش قرار تنخواہیں وصول کیں اور اب یہ ایسی سازشوں کی رہنمائی کر رہا ہے۔ جو کسی شریف انسان کے لئے باعث فخر نہیں ہو سکتیں۔ میں اس کی ساری بکواس کا یہی جواب دے سکتا ہوں کہ جب یہاں کے عوام حق خود اختیاری کے قابل ہو جائیں گے تو وہ اس کے پاس اس حق کے لئے بھیک مانگنے نہیں جائیں گے۔ (نوائے وقت (اشاعت خاص) ۲۳ مارچ ۱۹۶۰ء)

اور پھر اس کے بعد وہ لارڈ ولنگڈن سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ اور اس کے پیچھے توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ ۱۱ دسمبر ۱۹۱۸ء کو بمبئی کے ٹاؤن ہال میں یہ معرکہ آرائی ہوتی ہے۔ حکومت کے چند زر خرید لارڈ مذکور کو بمبئی سے الوداع کرتے ہوئے اہالیانِ شہر کی طرف سے اُسے ایڈریس پیش کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ جناح لارڈ ولنگڈن کی مکروہ سازشوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس نے اپنے منصبِ جلیل کا احترام بالائے طاق رکھ کر کس بد باطنی سے مسلم لیگ کے بمبئی کے اہم اجلاس کو سلیمان قاسم مٹھا جیسے غنڈوں کے ذریعے ناکام بنانے کی در پردہ سازش کی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے رفقاء سمیت ٹاؤن ہال کے اس سرکار پرست اجتماع میں پہنچ جاتے ہیں اور جب پولیس انہیں وہاں سے بزور باہر نکال دیتی ہے تو ٹاؤن ہال کے باہر اہالیانِ بمبئی کا نمائندہ اور تاریخی اجتماع ہوتا ہے اور کروڑوں انسانوں کا یہ زعیم اس اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے عوام کی قوت اور اپنی عظمت کے جھنڈے گاڑ دیتا ہے۔ لارڈ ولنگڈن اور اس کے حاشیہ برداروں کے منصوبوں کے پرخچے اڑاتے ہوئے وہ اپنے فتحمند اور پُرجوش حاضرین سے کہتا ہے۔

> آپ نے آج جمہوریت کو کامیابی سے ہمکنار کر دیا۔ آج آپ نے دنیا پر واضح کر دیا کہ نوکر شاہی اور مطلق العنانی دونوں مل کر بھی آپ کو خوفزدہ نہیں کر سکتیں۔ ۱۱ دسمبر کا دن بمبئی کی تاریخ میں جشنِ مسرت کا دن ہے۔ جائیے اور خوشیاں منائیے۔ آج جمہوریت کی فتح اور سربلندی کا دن ہے۔

عوام کی کامیابی اور جمہوریت کی فتح کے ساتھ ساتھ یہ دن قائدِ اعظم کی فائز المرامی کا دن تھا۔ بمبئی کے عوام ان کے

اعزاز میں جناح میموریل ہال کا سنگِ بنیاد رکھ رہے تھے۔ اور بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو وارفتگی کے عالم میں نعرہ لگا رہی تھیں "پیامبرِ اتحاد، زندہ باد"۔

استبداد کا مقابلہ

جنگِ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ ہندوستان کے جانباز سپاہی مشرقِ وسطیٰ کے میدانوں میں خون کی ندیاں بہا کر برطانیہ کی سرخروئی اور فتحمندیوں کا پرچم بلند کر چکے تھے۔ ان قربانیوں کا حق ادا کرنے کے لئے مانٹیگو چیمسفورڈ کے نام پہ چند رسمی اصلاحات کے نفاذ کی راہ ہموار کی جا رہی تھی۔ عین اس وقت جبکہ یہ نمائشی کھیل رچایا جا رہا تھا۔ امپیریلزم کے ایوانوں میں عوام کی جمہوری امنگوں کے خلاف ایک پُرفریب اور خطرناک سازش بھی پرورش پا رہی تھی۔ یہ تھا رولٹ ایکٹ جیسے متشددانہ اور ظالمانہ قانون کے نفاذ کا منصوبہ — اس تعزیری قانون کے ذریعے عوام کی آزادیٔ تحریر و تقریر اور اظہارِ مافی الضمیر کے خلاف حکومت کو ہولناک ہنگامی اختیارات سے مسلح کیا جا رہا تھا۔

جناح یہ سب کچھ دیکھتے ہیں اور عوام کی نمائندگی کا حق ادا کرنے کے لئے وہ امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے اجلاس میں پورے غیظ و غضب سے آتش فشاں پہاڑ کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں۔ رولٹ ایکٹ کے خلاف ایوانِ کونسل میں ان کی یہ تقریر و خطابت، قوتِ استدلال، غیرتِ قومی اور قہر و جلال کا ایک سیلاب تھی جو برطانوی نمائندوں کے سارے دلائل کو تنکوں کی طرح بہا کر لے گئی۔ لیکن یہ بل منظور کر لیا گیا اور جناح کی غیرت کے لئے اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہ رہا کہ وہ امپیریل کونسل کی رکنیت سے مستعفی ہو جائیں۔ اس سلسلہ میں وائسرائے بہادر کے نام قائدِاعظم کا احتجاجی خط ایک تاریخی یادداشت کی حیثیت رکھتا ہے اور حیاتِ قائد کے سلسلۂ تفاصیل کے کسی مناسب مرحلہ پر ہم یقیناً اس خط اور امپیریل کونسل کی تقریر کو قارئین کے سامنے لائیں گے۔

رولٹ ایکٹ برطانوی حکومت کی متشددانہ پالیسی کا آئینہ دار ثابت ہوا۔ پورے ملک میں اس کے خلاف غم و غصہ کی ایک آگ سی بھڑک اٹھی۔ جگہ جگہ ہڑتالیں اور مظاہرے ہوئے۔ جواباً پولیس اور فوج نے انتہائی بربریت اور استبداد کا مظاہرہ کیا۔ حادثۂ جلیانوالہ باغ اس ظلم و استبداد کا انتہائی انسانیت سوز مظہر تھا۔ امرتسر کے باغ میں کوئی بیس ہزار کا اجتماعِ عام رولٹ ایکٹ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لئے جمع تھا کہ جنرل ڈائر فوج کا ایک دستہ لے کر نمودار ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے حکم پر سینکڑوں انسان خاک و خون میں تڑپنے لگے۔ وحشت و بربریت کا یہ وہ ہیبت ناک شاہکار تھا جس کے خلاف پورے ملک میں غیظ و غضب کا طوفان برپا ہو گیا۔ جناح اس صورتِ حال پر مُہر بہ لب کیونکر رہتے۔ جوشِ غضب سے وہ گویا پابیخ اُٹھے اور کہا۔

> رسوائے عالم صدر رولٹ کمیٹی کے "سٹار چیمبر" میں وضع کئے ہوئے قوانین جن پر لارڈ چیمسفورڈ کی حکومت نے عمل درآمد شروع کیا ہے ایسے ہیبت ناک جرائم پر منتج ہوئے ہیں۔ جن کو نہ تو کوئی آدمی بیان کر سکتا ہے اور نہ عورتوں کے آنسوؤں کی روانی انہیں دھو سکتی ہے ...... یقیناً اب ہمیں وہی ذرائع اختیار کرنے پڑیں گے جو فرانس اور اٹلی میں اختیار کئے گئے۔

(قائدِاعظم محمد علی جناح)

اہنسا اور ستیہ گرہ کی بوالعجبیاں

اس مرحلہ پر ہم ملکی سیاسیات کی تاریخ کو ایک نیا رُخ اختیار کرتے دیکھتے ہیں۔ گاندھی جی یکایک "اہنسا" اور "ستیہ گرہ" کے عجیب و غریب پروگرام لئے مہاتمائی روپ میں کانگریس کے پلیٹ فارم سے نمودار ہوتے ہیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی بوالعجبیوں سے سب پر چھا جاتے ہیں۔ جناح کی دوربین نگاہیں ان حربوں کو نہ صرف سیاسی طور پر مضحکہ خیز قرار دیتی ہیں بلکہ انہیں یہ بھی واضح طور پر نظر آتا ہے کہ اس راہ میں مسلمانانِ ہند بالآخر اس سرمایۂ حیات سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے جو صدیوں سے ان کی اسلامی نفسیات کے لئے نشانِ راہ کا کام دیتا چلا آ رہا ہے۔ انہوں نے حتی الامکان سب کو اس پروگرام کے نتائج سے خبردار کرنے کی کوشش کی اور جب اس طرح وارد ھا کے سامری کا جادو نہ ٹوٹ سکا تو ۱۹۲۰ء میں دامن جھاڑ کر کانگریس سے الگ ہو گئے۔ فروری ۱۹۲۱ء میں سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی (بمبئی) کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے وہ اپنے مؤقف کی وضاحت کرتے ہیں۔ اور اہنسا اور ستیہ گرہ کے مضحکہ خیز پروگرام کی مضحکہ خیز حقیقت کو یوں واشگاف کرتے ہیں۔

> حکومت کا مقابلہ کرنے کے لئے سب سے مقدس شے فوجی قوت کا حصول ہے۔ جرمنی نے میدانِ جنگ میں آنے سے پہلے چالیس سال تک فوجی تیاری کی۔ ہندوستان نے آخر فوجی قوت کا کونسا ذخیرہ جمع کیا ہے۔ اور ہمارے پاس اس نوعیت کے کون سے ذرائع ہیں۔ گاندھی جی نوجوانوں سے کہہ رہے ہیں کہ اسکولوں اور کالجوں کو چھوڑ کر باہر نکل آئیں۔ اور دیہات میں پھیل جائیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ آخر یہ کس لئے؟ (قائداعظم محمد علی جناح)

کانگریس سے مقابلہ

۱۹۲۳ء میں جناح نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے مرکزی امپیریل کونسل کا انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا اور دنیا نے انتہائی حیرت سے دیکھا کہ کانگریس ان کے مقابلہ میں پورے جوش و خروش سے اپنا امیدوار لا رہی ہے۔ بہرطور جناح آزاد امیدوار کی حیثیت سے کسی سہارے کے بغیر تن تنہا انتخابی میدان کھڑے ہیں اور دوسری طرف آل انڈیا نیشنل کانگریس اپنی ملک گیر قوت کے ساتھ ان کے مقابلہ میں پر تول رہی ہے۔ یہ وہی جناح ہیں جو کل تک کانگریس کے پلیٹ فارم کی زیب و زینت تھے۔ جنہیں "سفیرِ اتحاد" اور "پیامبرِ اتحاد" کہتے ہوئے ان کی زبانیں نہیں تھکتی تھیں۔ جن کے اعزاز میں جناح میموریل ہال کی تعمیر ہوئی تھی۔ جس کی سیاسی بصیرت، حسنِ تدبر اور جرأت و بے باکی کانگریس کے لئے بیش بہا سرمایۂ نازش و افتخار قرار پا چکا تھا۔ اب وہی کانگریس اس زعیم حریت کو شکست دینے کے لئے مسلح ہو رہی تھی۔

لیکن ہر نگہ بصیرت جناح کی عظمتِ کردار کے سامنے سرِ تسلیم خم کر رہی ہے۔ بمبئی کے رائے دہندگان اب بھی اس کی قدر و قیمت سے بخوبی معترف ہیں۔ انہیں اب بھی لارڈ سٹیڈنہم اور لارڈ ولنگڈن جیسے استعمار و استبداد کے ہیبت ناک مجسموں سے اس بے باک زعیم کے ٹکراؤ کی داستانیں پوری طرح یاد ہیں۔ چنانچہ خود کانگریس کا اپنا آرگن "بمبئی کرانیکل" جرأت سے آگے بڑھتا ہے اور جناح کی حمایت میں رائے دہندگان کے نام ایک پُرزور اپیل شائع کرتا ہے۔ اس اپیل کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں۔

> دو ایک سال سے ہمارے اور مسٹر جناح کے درمیان کچھ اختلافات چلے آ رہے ہیں۔ لیکن

ان کی گذشتہ عظیم الشان خدمات، سچی حب الوطنی اور جذبۂ حریت ایسی صفات ہیں جو نہ تو کسی سفارش کی محتاج ہیں اور نہ ہی کوئی شخص ان کی عظمت کو کم کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں جناحؒ کے ناقابلِ تسخیر جذبۂ جہاد نے باقی شہریوں کے مقابلہ میں انھیں بہت امتیازی مقام عطا کر دیا ہے اور حقیقتاً وہی ایک ایسی ہستی ہیں جو صحیح معنوں میں اہلِ بمبئی کی کماحقہٗ نمائندگی کر سکتی ہے..... موجودہ فضا جناحؒ کے مخصوص سیاسی رجحانات اور اندازِ فکر سے بہترین مناسبت رکھتی ہے۔ اور اگر معمولی اختلافات کی بنا پر جناح جیسے قائد کو ملکی خدمات اور قومی جدوجہد کے اس منصب سے محروم کر دیا گیا۔ تو یہ ایک ناقابلِ فراموش ذلت کا ارتکاب ہوگا۔

بمبئی کے عوام نے دیوانہ وار اس اپیل پر لبیک کہا۔ وہ اپنے محبوب زعیم سے بے وفائی کے لئے تیار نہ ہو سکے۔ کانگریس کا امیدوار میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ کانگریس چاروں شانے چت گری اور بمبئی کے عوام کی آنکھ کا تارا بلا مقابلہ کامیابی کا سہرا باندھ کر عوام کی نمائندگی کے لئے امپیریل کونسل میں پہنچ گیا۔ بلاشبہ جناحؒ نے تیسری گول میز کانفرنس (۱۹۳۵ء) تک ہندو مسلم اتحاد کی مساعی جاری رکھیں۔ لیکن کانگریس پر سے ان کا اعتماد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اٹھ گیا اور تاریخ گواہ ہے کہ جناحؒ کی رفاقت اور مشاورت کو ٹھکرا کر کانگریس کو جو قیمت ادا کرنی پڑی اور پے در پے جن ہزیمتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کی مثال تاریخ کے صفحات سے ناپید نظر آئے گی۔

چودہ نکات جناحؒ اور نہرو رپورٹ

رولٹ ایکٹ اور حادثہ جلیانوالہ باغ کے حادثات، برطانوی سامراج کی پیشانی پر جورِ استبداد کے بدترین داغ ثابت ہوئے۔ ان داغوں کو دھونے کی جو پُرفریب اور نمائشی کوششیں لندن سے شروع کی گئیں ان میں سائمن کمیشن کے تقرر کا اعلان اہم حیثیت رکھتا ہے۔ اس کمیشن کے قیام کا مقصد آئینی اصلاحات کے نفاذ کے لئے ملکی حالات کا جائزہ ظاہر کیا گیا۔ لیکن اس کمیشن میں جسے سر جان سائمن کی قیادت حاصل تھی۔ کسی ہندوستانی نمائندے کو شامل کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ یہ اس ملک کے سیاسی شعور اور قومی نمائندگی کی افسوسناک توہین تھی۔ چنانچہ جونہی وزیرِ ہند لارڈ برکن ہیڈ نے ۸ نومبر ۱۹۲۷ء کو اس کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا۔ ملک کی تمام قابلِ ذکر سیاسی جماعتوں نے اس کے مقاطعہ کا اعلان کر دیا۔ جناحؒ نے صورتِ حال کے ہر پہلو پر سنجیدگی سے غور و فکر کیا۔ ہندو مسلم اتحاد کے سلسلے میں امید کی ایک نئی کرن ان کے ذہن میں ابھری اور اپنی سیاسی بصیرت کا اشارہ پاتے ہی وہ دلائل و براہین سے مسلح ہو کر میدان میں آ گئے۔ انہوں نے لارڈ برکن ہیڈ اور لارڈ ریڈنگ کے اعلانات کو چیلنج کیا۔ انہوں نے کمیشن کی ہیئتِ ترکیبی پر شدید نکتہ چینی کی اور واضح کیا کہ اس کمیشن کا تقرر برطانوی حکومت کے ان تمام دعووں کا منہ چڑا رہا ہے جو اب تک ہندوستانیوں کو مشترک حکومت بنانے کے لئے کئے گئے تھے۔

چنانچہ جونہی ۳ فروری ۱۹۲۸ء کو کمیشن نے ساحلِ بمبئی پر قدم رکھا اس کے مقاطعہ کے سلسلہ دراز کا آغاز ہو گیا۔ وائسرائے بہادر کی طرف سے تعاون کئے جانے کی تمام اپیلیں ہائے استغفار سے ٹھکرا دی گئیں اور پورے ملک میں جگہ جگہ کمیشن انتہائی مخالفت، کالی جھنڈیوں اور ہڑتالوں کے پُرجوش مظاہروں سے دوچار ہو رہا تھا۔

جناح اس میدان میں پیش پیش تھے۔ ان کی کوششوں سے مرکزی اسمبلی نے بھی کثرت رائے سے کمیشن کے ساتھ تعاون کی پیش کش مسترد کر دی اور پھر دیگر ممبران اسمبلی کی رفاقت سے انہوں نے ۲ر فروری کو ایک اپیل شائع کی کہ تمام سیاسی جماعتیں اور صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کمیشن سے قطع تعلق رکھیں اور ایک آل پارٹی کنونشن کے ذریعے ملک کا آئین متفقہ طور پر مرتب کیا جائے تاکہ اسے پورے ملک کے متفقہ مطالبے کی حیثیت سے حکومت کے سامنے رکھ دیا جائے۔

جناح کی ان مخلصانہ مساعی کی بدولت ۱۹ مئی ۱۹۲۸ء کو بمبئی میں آل پارٹیز کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ پھر ۲۸ اگست کو لکھنؤ میں یونٹی کانفرنس ہوئی اور اس کانفرنس نے ملکی اتحاد کے سلسلہ میں جو تجاویز طے کیں ان پر آخری بار مہر تصدیق ثبت کرنے کے لئے ۲۲ دسمبر کو آل پارٹیز نیشنل کنونشن کا تاریخی اجتماع کلکتہ میں ہوا۔ جناح اس کنونشن میں مسلم لیگی وفد کے قائد کی حیثیت سے شریک ہوئے اور اپنے مشہور چودہ نکات پر مشتمل فارمولا پیش کیا۔ لیکن مہاسبھائی عناصر نے ان نکات کی پُرزور مخالفت کی اور نہرو کمیٹی کی مرتب کردہ رپورٹ کے مقابلہ میں ان نکات کو جو صورتِ حال کا بہترین حل پیش کرتے تھے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ملک کا یہ تاریخی کنونشن، افراتفری، ذہنی انتشار اور باہمی تلخیوں کی مایوس کن فضا میں ختم ہوا اور اس کی ناکامی نے حکومت خود اختیاری کے امکانات تاریکیوں سے ہم کنار کر دیئے۔ ساتھ ہی مسلم لیگ نے اپنے سالانہ اجلاس دہلی میں جو قائداعظم کی صدارت میں ہوا نہرو رپورٹ کو کلیتہً مسترد کر دیا۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کا دور

ہندوستان کی سیاسی زندگی میں اب چاروں طرف مایوسیوں کا گرد و غبار چھا چکا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی اعتماد کی فضا کلیتہً ختم ہو چکی ہے۔ خود مسلمان چھوٹی چھوٹی پارٹیوں میں تقسیم ہو کر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ ان کی جمعیت پریشان اور قومی اتحاد زیروزبر ہو چکا ہے۔ ملک کا ہر رہنما صورتِ حال سے شدید طور پر متاثر ہے۔ تحریک استخلاص وطن کی نیا منجدھار میں ہچکولے کھا رہی ہے۔ ملک کے مطلع تقدیر پر امید کی ادنیٰ کرن دکھائی نہیں دیتی۔ بگڑی بننے کے امکانات مسدود ہو چکے ہیں۔ مایوسی اور انتشار کی اس دردناک کیفیت میں صرف ایک قائد ہے جو اب بھی خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال ہے جو اب بھی پورے یقین و اعتماد سے پکار رہا ہے۔

> اخلاقی قوت، دلیری، محنت اور استقلال وہ چار ستون ہیں جن پر انسانی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے۔ میں کبھی ناکامی کے لفظ سے آشنا نہیں ہوا۔

اور یہ وہی جواں ہمت جناح ہے جس کی ملکی اتحاد کی تمام مساعی پر مہاسبھائی ذہنیت نے پانی پھیر دیا۔ جس کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو گلے ملانے کے تمام منصوبے خاک میں ملا دیئے گئے۔ جس نے دونوں قوموں کو آزادی کی نعمت سے مالا مال کرنے کے لئے شب و روز تگ و تاز کی۔ لیکن اس کی پُرخلوص صداؤں کو ہمیشہ بہرے کانوں سے سنا گیا۔ لیکن جناح اب بھی مایوس نہیں۔ وہ اپنی زندگی کی محبوب قومی آرزوؤں اور امنگوں کی چتا کو جلتے

دیکھ کر بھی مستقبل کے افق سے امیدوں کی نئی کرنیں تلاش کر رہے ہیں۔

سائمن کمیشن مایوس لوٹ رہا ہے۔ لارڈ ریڈنگ مایوس ہیں۔ وزیر ہند لارڈ برکن ہیڈ کے چہرے پر افسردگی کے آثار ہیں۔ وزیر اعظم برطانیہ رمزے میکڈانلڈ کا سیاسی تدبر اور فراست کوئی منزل سامنے نہیں پاتے۔ مہاتما کی اہمسا اور ستیہ گرہ کی تحریکیں دم توڑ چکی ہیں۔ لیکن جناح! وہ دیکھئے ان کے دل و دماغ اب بھی پوری طرح متحرک ہیں۔ سائمن کمیشن کے انگلستان پہنچنے سے قبل ہی ان کا اہم مکتوب وزیر اعظم برطانیہ کی میز پر پڑا ہے۔ وہ حکومت برطانیہ کے تدبر اور فراست سے اپیل کر رہے ہیں کہ سائمن کمیشن کی رپورٹ اور حکومت ہند کی آرا موصول ہوتے ہی ہندوستان کے لئے حکومت خود اختیاری اور درجۂ مستعمرات کا اعلان کریں۔ اور ان آئینی اصلاحات کے خط و خال اور جزئیات متعین کرنے کے لئے لندن میں ہندوستان کے نمائندوں کی مشاورتی کونسل طلب کریں۔ وزیر اعظم، سر جان سائمن کی واپسی کے منتظر ہیں اور جونہی وہ انگلستان واپس پہنچتے ہیں اور وزیر اعظم ان سے جناح کی تجویز کے بارے میں مشورہ طلب کرتے ہیں تو وہ بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ واقعی ہندوستان سے دوستانہ تعلقات استوار کرنے کی یہی ایک راہ باقی ہے۔ یہی وہ واحد اساس ہے جسے از سر نو مذاکرات کا حرف آغاز بنایا جا سکتا ہے۔

سر سائمن کی تائید کے بعد جناح کی تجویز سلطنت برطانیہ کے ممتاز ترین کارفرماؤں کے غور و فکر اور تبادلۂ خیالات کی بنیاد قرار پا جاتی ہے۔ برطانوی حکومت اور ہندوستانی رہنماؤں کے مابین ایک کانفرنس کے انعقاد کے امکانات پر پوری سنجیدگی سے غور و فکر کیا جاتا ہے اور بالآخر ۱۹۳۰ء میں پہلی گول میز کانفرنس کا انعقاد عمل میں آتا ہے۔ کانگریس اس کانفرنس کا مقاطعہ کرتی ہے لیکن ہندوستان کے مختلف مکاتیب فکر کے نمائندے انگلستان پہنچتے ہیں اور لندن کا یہ یادگار اجتماع پوری دنیا کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ جناح بہ نفس نفیس اس کانفرنس میں شریک ہوتے ہیں۔ انتہائی خلوص اور قابلیت سے چالیس کروڑ ہندوستانیوں کی ترجمانی کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ لیکن کانگریس کے بائیکاٹ اور مہاسبھائی عناصر کی متعصبانہ ذہنیت کے منفی حربوں کے باعث یہ کانفرنس مثبت نتائج پیدا کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے۔

پھر دوسری کانفرنس منعقد ہوتی ہے جس میں کانگریس بھی شرکت کرتی ہے۔ جناح اس کانفرنس کی کامیابی کے لئے شب و روز جدوجہد کرتے ہیں۔ لیکن کانگریس کے لیڈروں کو مفاہمت اور رواداری کی کسی معقول سطح پر لانا ان کے امکانات میں نہیں ہوتا۔ یہ کانفرنس بھی ناکام ہو جاتی ہے۔

تیسری گول میز کانفرنس میں جناح شریک نہیں ہوتے۔ وہ زندگی میں پہلی بار سات سال کے اس مسلسل سفر سے "گریز کی راہ" اختیار کرتے ہیں۔ جس کا انھیں نہ کوئی مستقبل نظر آتا ہے اور نہ آگے قدم بڑھانے کے لئے کوئی نشانِ راہ۔ ان کی زندگی کا یہ عظیم ترین ردِ عمل نہ صرف مہاسبھائی ذہن کی فساد انگیزیوں کا نتیجہ تھا بلکہ اس سے کہیں زیادہ مہاتما جی اور ان کے چیلوں چانٹوں کی جفائے وفا نما نے ان کے قلب و نگاہ کو متاثر کیا۔ اب ان کی زندگی کا اہم ترین موڑ ان کی نگاہوں سے سامنے تھا۔ کلکتہ کی آل پارٹیز نیشنل کنونشن اور لندن کی پہلی دو گول میز کانفرنسوں میں جو کچھ انھوں نے اپنی آنکھ سے دیکھا۔ اس کے بعد ان کا

حقیقت پسند ذہن انہیں، خوش فہمیوں اور خود فریبیوں میں مبتلا رکھنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ دوسری طرف تاریخ کی ایک نئی حقیقت ابھر کر ان کی نگاہوں کے سامنے آگئی تھی۔ ہندو لیڈر مختلف قسم کے پُرفریب لبادے اوڑھ کر ہندو قوم کا سنگھٹن مضبوط سے مضبوط تر کئے جا رہے تھے اور ان کی اپنی ملت کا قافلہ صدیوں کے عروج و اقبال سے بے نصیب ہو کر سرِ راہ بھیڑ بکریوں کی طرح منتشر اور پریشان حال کھڑا تھا۔ حرکت اور عمل کے اس وسیع سمندر میں جو رنگون سے پشاور تک پھیلا ہوا تھا۔ ان کی اپنی ملت کا سفینہ پرخروش لہروں کے رحم و کرم پر بہے چلا جا رہا تھا۔ اس نیّا کا نہ کوئی کھیون ہار تھا اور نہ کوئی ساحلِ مراد۔

اہم موڑ اور نئی منزل

خلوص و ایثار اور عزم و ہمت کے اس پیکر نے جب صورتِ حال کا از سرِ نو جائزہ لیا اور اس کی نگاہوں نے تصویر کے اس رخ پر بھی نگاہ ڈالی تو اس کی نگاہیں وہیں جم کر رہ گئیں۔

کیا اس قابلِ رحم قوم کے لئے میرے ذمے کوئی فریضہ نہیں؟

یہ سوال پوری شدت سے ان کے ذہن میں ابھرا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ زبانِ حال سے پکار اُٹھے ـــــ آہ! میری قوم!!

یہ ذہنی تاثر اس قدر شدید تھا کہ کچھ مدت کے لئے اُن کے قلب و نگاہ گویا منجمد سے ہو کر رہ گئے۔ سارے رہنما لندن کانفرنس سے عازمِ وطن ہو گئے۔ لیکن جناح! ایک گہری فکر کی استغراقی کیفیت چہرے پر لئے اور ہیجان و اضطراب کے سینکڑوں طوفان سینے میں سمٹائے وہیں لندن کے ایک گوشے میں وقفِ سکون ہو کر رہ گئے۔ ایک تقریر میں اپنی اس کیفیت کو بے نقاب کرتے ہوئے ـــــ بلکہ یوں سمجھئے کہ ماضی کی ناکامیوں کا صاف صاف اعتراف کرتے ہوئے ـــــ انھوں نے کہا تھا۔

> اُس وقت میرے احساسات پر قنوطیت چھا گئی تھی۔ میرے جذبات پر مایوسیاں منڈلا رہی تھیں۔ میں اپنے ملک سے نا امید ہو گیا تھا۔ صورتِ حال انتہائی بدنصیبوں کی مظہر تھی۔ مسلمان بے یار و مددگار کھڑے تھے۔ ان کا کوئی پرسانِ حال ہی نہ تھا۔ کبھی دولتِ برطانیہ کے کاسہ لیس ان کی قیادت سنبھال لیتے اور کبھی کانگریس کے حاشیہ بردار ان کی نمائندگی کے مدعی بن جاتے۔ جب بھی انہیں متحد اور منظم کرنے کی کوئی کوشش ہوئی سرکار کے ٹوڈیوں اور کانگریس کیمپ کے ضمیر فروشوں نے ان کی کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں نہ تو ہندوستان کی کوئی مدد کر سکتا ہوں اور نہ ہندو کی ذہنیت بدل سکتا ہوں اور نہ مسلمانوں کو ان کی نازک حالت کا یقین دلا سکتا ہوں۔ یہ احساسِ بے چارگی اس قدر بڑھا کہ میں لندن ہی میں اقامت گزیں ہو کر رہ گیا۔ اس لئے نہیں کہ مجھے ہندوستان سے محبت نہیں رہی تھی بلکہ مجھے اپنی بے بسی کا پورا احساس ہو گیا تھا۔ (تقاریرِ جناح)

۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۴ء تک وہ چار سال انگلستان میں رہے۔ اس دوران میں وہ ملکی صورتِ حال سے پوری طرح

باخبر رہے۔ لیکن عملی سیاسیات سے ایک طرح کا تعلق منقطع رکھا اور اس ساعتِ سعید کے لیے تابی سے منتظر رہے، جب وہ اپنی ملت کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو ساحلِ مراد تک پہنچانے کے قابل ہو سکیں۔

صوبہ جاتی خود مختاری کا نیا مرحلہ اور انگلستان سے واپسی

لندن کی ہر سہ کانفرنسوں کے بعد آخر وہ وقت آ گیا جب جناح نے دس کروڑ اسلامیانِ ہند کی ناخدائی کے لئے ہندوستان کا رُخ کیا اور ہندوستان کے مطلعِ سیاست پر آفتاب بن کر جلوہ بار ہو گئے۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء نے ملک کے سامنے صوبجاتی خود مختاری (PROVINCIAL AUTONOMY) کی نئی منزل پیش کی۔ دس کروڑ بے یار و مددگار مسلمانوں کی نگاہیں رہ رہ کر ان کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ علامہ اقبالؒ اور دیگر عمائدینِ ملت نے انھیں تار ارسال کئے اور عزت و حرمت کا واسطہ دے کر انگلستان سے واپس پہنچنے کی اپیل کی۔ پیکرِ ایثار جناح قوم کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے اپنے وطن روانہ ہو پڑے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے مسلم لیگ کو متحرک اور صحت مند سیاسی نظام میں تبدیل کرنے کی جد و جہد شروع کی اور پھر اسلامیانِ ہند سے اپیل کی کہ صورتِ حال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے ایک جسدِ واحد کی طرح اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں۔

قومی تنظیم کا عزم بلند

مسلم لیگ کی تطہیر اور تنظیم جدید بجائے خود ایک کٹھن اور صبر آزما مرحلہ تھا۔ نئے انڈیا ایکٹ کے تحت ملک کے عام انتخابات قریب آ چکے تھے۔ کانگریس پوری طرح منظم اور کیل کانٹے سے لیس ہو چکی تھی۔ مسلمانوں میں چاروں طرف انتشار کا دور دورہ تھا۔ کچھ برطانوی سامراج کی حاشیہ برداری کو وظیفۂ زندگی بنا چکے تھے۔ کچھ مقدس جبّوں میں لپٹے ہوئے "امام الہند" اور "شیخ الہند" تھے جنہوں نے وردھا آشرم اور آنند بھون سے رشتۂ وفا استوار کر رکھا تھا۔ وقت کا ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ جناح نے بڑے بڑے شہروں کا دورہ کیا۔ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے افرادِ ملت کو دعوتِ تنظیم دی۔ پارلیمنٹری بورڈ قائم کیا۔ لیکن وقفہ اتنا مختصر تھا کہ ۱۹۳۷ء کے صوبائی انتخابات میں جو نتائج سامنے آئے وہ زیادہ امید افزا نہیں تھے۔ کانگریس نے گیارہ میں سے سات صوبوں میں اکثریت حاصل کی اور وہاں اپنی وزارتیں قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ مسلم لیگ کو بنگال اور سندھ میں خالص مسلم لیگی وزارتیں قائم کرنے کا موقع مل سکا۔ لیکن قافلہ سالارِ منزلِ مقصود تک پہنچنے کا عزم کر چکا تھا۔ اس نے اپنی جان توڑ جد و جہد جاری رکھی۔

اسی دوران میں اقبالؒ و جناح میں وہ تاریخی خط و کتابت ہوئی جس میں نہ صرف مستقبل کے قومی سفر کی راہ متعین کی گئی بلکہ اس سفر کے نشانِ راہ بھی۔ انہی میں سے ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کے ایک مکتوب میں علامہ موصوف نے جناب جناح کو خراجِ اعتماد پیش کرتے ہوئے یہ لکھا تھا۔

> ہندوستان میں آپ ہی کی ذات ایسی ہے جس سے قوم کو یہ امیدیں وابستہ کرنے کا حق حاصل ہے کہ مستقبل میں جو سیلاب آنے کا خدشہ ہے اس میں صرف آپ ہی ملت کی صحیح راہنمائی کر سکیں گے۔

لکھنؤ کا سالانہ اجلاس

اب جناح پوری ملّت کی نگہ امید کا مرکز تھے۔ ملّت اپنی عقیدت اور اعتماد کے اظہار میں انہیں "قائدِاعظم" کے خطاب سے معنون کر چکی تھی۔ ان کی آواز کروڑوں دلوں کی ترجمان تھی۔ مرکزی اسمبلی میں ان کی دھواں دھار تقریریں سامراج اور کانگریس کے نمائندوں کے لئے ایک مستقل چیلنج کی شکل اختیار کر گئیں اور قومی اسٹیج سے ان کے نعرہ ہائے حریت نے پورے ملک کی فضا میں ایک ارتعاش سا پیدا کر رکھا تھا۔ اسی دوران میں لکھنؤ میں (اکتوبر ۱۹۳۷ء میں) مسلم لیگ کا وہ بے مثال سالانہ اجلاس ہوا جس کے جاہ و جلال اور کرّوفر نے مخالفین کی صفوں میں زلزلہ ڈال دیا۔ یہی اجلاس تھا جس میں پنجاب کے یونینسٹ وزیر اعظم سر سکندر حیات اور بنگال کی کرشک پرجا پارٹی کے قائد اور وزیر اعظم مولوی ابوالقاسم فضل الحق اپنے وزراء سمیت بہ نفسِ نفیس شریک ہوئے۔ اور آل انڈیا سیاسیات میں اپنی وفاؤں کی نذر قائدِاعظم کے حضور میں پیش کر دی۔

لکھنؤ کے قومی اجتماع نے واردھا اور آنند بھون کے سارے طلسم توڑ کر رکھ دیئے۔

اسی اجلاس سے متاثر ہو کر یو پی کے ایک دور اندیش کانگریسی رہنما ڈاکٹر محمود اللہ نے کہا تھا۔

اس وقت دو بڑی ایشیائی تہذیبوں کے تصادم کا فوری اور ہولناک امکان ہے۔
مسلم لیگ نے مسلمانوں کو جنگ کی دعوت دی ہے اور مسلمان کسی چیز سے اتنا خوش نہیں ہوتا
جتنا جنگ کرنے سے۔ (مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل)

یہ اجلاس اسلامیانِ ہند کی قومی زندگی میں نشأۃ ثانیہ کا ایک انقلاب آفریں موڑ ثابت ہوا۔ ملّت کے قلب کی گہرائیوں سے امنگوں اور آرزوؤں کا ایک نیا چشمہ پھوٹ پڑا۔ ان کے خون میں بازآفرینیوں کی ایک نئی لہر موجزن ہو گئی۔ یوں سمجھئے کہ مدتوں کے بعد انہوں نے اپنی گم گشتہ منزل کو پا لیا ——— اپنے آپ کو پا لیا۔

اب یہ قافلہ ایک نئے عزم اور نئے ولولوں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ مسلمانانِ ہند اپنے اجتماعی بقا کے لئے اب مردانہ وار اور پوری یکجہتی و ہم آہنگی سے اپنے دشمنوں کے بالمقابل نبرد آزما تھے۔ ان کی صفوں میں پہلی بار مدت کے بعد نظم و ضبط کی حوصلہ افزا کیفیت نظر آ رہی تھی اور اسی کا صدقہ تھا کہ انہوں نے دشمنوں کی شاطرانہ چالیں، مکروہ سازشیں اور ناپاک منصوبے خاک میں ملا دیئے۔

پاکستان کی تحریک کا آغاز

اجلاس لکھنؤ کے کوئی ڈھائی برس بعد لاہور میں (مارچ ۱۹۴۰ء) آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک سالانہ اجتماع ہوا۔ قائدِاعظم نے اس اجلاس کی صدارت فرمائی اور پہلی بار قراردادِ پاکستان کے ذریعے حقِ خود اختیاری اور استقلال کی منزلِ مقصود کی طرف قومی سفر کا آغاز کیا۔ قراردادِ لاہور ایک بانگِ رحیل تھی جس کی آواز سنتے ہی ہماری ملّت کا قافلہ سامانِ سفر باندھ کر رواں دواں آگے بڑھا اور بالآخر سات برس بعد اس نے منزلِ مقصود پر اپنی فتح و کامرانی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ "تحریکِ پاکستان" ہمارے اس سلسلۂ تحریر کا ایک الگ اور مستقل عنوان ہوگا۔ اس عنوان کے تحت ہم اس تحریک کی طویل داستان پوری تفصیل سے بیان کریں گے۔ اس مرحلہ پر ہم صرف یہی بتانے پر اکتفا کریں گے کہ مارچ ۱۹۴۰ء سے اگست ۱۹۴۷ء تک اس صبر آزما سفر کے دوران بڑے بڑے نازک مرحلے ملّت کے سامنے آئے۔ بڑے بڑے جبار اور مکار دشمنوں سے

ٹکراؤ ہوا۔ بڑی بڑی خطرناک سازشوں سے الجھنا اور بڑی بڑی ابتلاؤں اور آزمائشوں سے گذرنا پڑا لیکن قائداعظم کی قیادت وہ یگانہ روزگار اور عظمت آفریں قیادت تھی جس کے مقابلے میں مشکلات و موانعات کے پہاڑ پانی ہو کر بہہ گئے۔ ابتلاؤں آزمائش کے طوفان گرد کی طرح بیٹھ گئے اور ملت اس جاہ و جلال سے پاکستان کی منزل مراد تک پہنچی کہ دنیا کے طول و عرض سے بے ساختہ تحسین و آفریں کے نعرے بلند ہوئے اور مشرق و مغرب نے برملا شہادت دی کہ قائداعظم بلاریب اس دور کے ایک عظیم ترین سیاست دان تھے۔

دنیا کے عظیم ترین اخبار "لندن ٹائمز" نے لکھا ہے۔

انھوں نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ پیش کر کے اپنے اس دعوے کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان میں وہ ذہنی لچک نہیں تھی جو انگریز کے نزدیک ہندوستانیوں کا خاصہ ہے۔ ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت، واضح اور بین ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں ایسی حیلہ سازی نہ تھی۔ بلکہ وہ جس نقطۂ نظر کو ہدف بناتے تھے اس پر براہِ راست نشان باندھ کر وار کرتے تھے۔ وہ ایک ناقابلِ تسخیر حریف تھے۔

آقائے علی اصغر حکمت سفیر ایران نے خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا ــــ

ایسے عظیم الشان انسان آسمان کے ان ستاروں کی مانند ہیں جن کی عظیم روشنی ہم تک بعید از قیاس فاصلے طے کر کے پہنچتی ہے اور اگرچہ وہ انسانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں لیکن ان کے نور سے ہمیشہ کسب فیض کیا جا سکتا ہے۔ قائداعظم کی شخصیت آئندہ نسلوں کیلئے مینارۂ نور کا کام دیگی۔

بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو ان کی عظمت پر مندرجہ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتی ہیں ــــ

زندگی کے حقائق کو جانچنے، پرکھنے اور تسلیم کرنے میں بلا کے محتاط اور غیر جانبدار۔ معاملات میں سوجھ بوجھ اور سلامت روی کے مظہر۔ مگر حقیقی مقصد کے لئے ناقابلِ شکست چٹان۔

سی۔ آر۔ داس کے الفاظ سنیئے ــــ

مسٹر جناح صرف مسلمانوں ہی کی نجی دولت نہیں۔ وہ پورے ہندوستان کیلئے سرمایۂ افتخار ہیں۔

سابق وزیراعظم انڈونیشیا سلطان شہریار نے کہا تھا ــــ

مسٹر جناح بے حد پرکشش انسان ہیں ــــ ایک مقناطیسی کشش ــــ ان کی آواز میں صداقت اور خلوص کی ایسی قوت کارفرما نظر آتی ہے جو میں نے بہت کم زعماء میں دیکھی ہے۔ بہت ہی کم زعماء ہیں ــــ میں عصر حاضر کے اکثر زعماء سے ملا ہوں۔ لیکن اپنے مافی الضمیر کے اظہار میں جتنی کامل قدرت قائداعظم کو حاصل ہے کسی دوسرے میں نظر نہیں آتی۔

سابق صدر امریکہ مسٹر ٹرومین نے ان کی وفات پر کہا تھا ــــ

دولتِ پاکستان کا معمار۔ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کا بانی۔ مجھے یقین ہے کہ مسٹر جناح کی غیر معمولی قیادت کی یاد حکومت پاکستان اور اس کے عوام کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔

باب دوم

ہندوستان اور پاکستان کی وسعتوں میں پھیلے ہوئے کروڑوں انسان آج آزادی کی شاداب فضاؤں میں شاہراہِ حیات پر قدم بڑھا رہے ہیں۔ لیکن ایک وقت تھا جبکہ غیر ملکی سامراج کی کارفرمائیوں نے یہاں زندگی کی گذرگاہوں میں استعمار و استبداد کے گھٹا ٹوپ اندھیرے پھیلا رکھے تھے۔ محکومی اور بے چارگی کی اس تاریک رات کو صبح کی بہارِ آزادی سے بدلنے کے لئے یہاں کے عوام کو کم و بیش نصف صدی تک حصولِ استقلال کی ایک طویل جنگ لڑنی پڑی۔ اس مقالہ میں ہم اس جنگ کی تفاصیل پیش نہیں کر رہے، بلکہ ہمیں صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اس جہادِ حریت میں قائدِ اعظم علیہ الرحمۃ کا مقام کیا تھا اور اس تحریکِ اخلاص کا فاتحانہ انجام کس حد تک اس نباضِ سیاست کے حسنِ تدبر اور رعنائی بصیرت کا رہینِ منت ہے۔

افترا پردازیوں کی تشہیر

اس داستان کا آغاز کرتے ہوئے ہم ان افسوسناک الزام بازیوں سے بے خبر نہیں جو سرزمینِ ایشیا کے اس عظیم المرتبت زعیم کے خلاف ان کے شکست خوردہ حریفوں کی زخم خوردہ اور منتقمانہ ذہنیت کی پیداوار ہیں اور جن کی تشہیر کا حقیقی سرچشمہ دراصل کانگریس کا وہ مہاسبھائی ذہن ہے جس کی شکست کے زخم آج تک مندمل نہیں ہو سکے۔ آل انڈیا کانگریس نے اگر بہتان طرازیوں اور افترا پردازیوں کی اس مذموم روش میں روڑوں روپے پانی کی طرح بہائے ہیں، تو اس حرکات کو سمجھنا قطعاً دشوار نہیں۔ اس روش پر نہ کسی اظہارِ افسوس کی ضرورت ہے اور نہ کسی شکوہ و شکایت کی۔ ہماری زندگی کی اصل بدنصیبی یہ ہے کہ الزام بازیوں کے اس محاذ پر ہمیں اپنی ہی ملت کے بڑے بڑے بزرگ نظر آتے ہیں۔ ان الزام بازیوں کا لبِ لباب انتہائی مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ قائدِ اعظم کی ساری جدوجہد کا محور ملک کی تحریکِ آزادی کو ناکام بنانا تھا اور انھوں نے پاکستان کا جو نعرہ بلند کیا تھا اس کا منتہیٰ و مقصود بھی یہی تھا کہ برطانوی سامراج کی مصلحتوں کو پورا کیا جائے۔ یہ پروپیگنڈا تحریکِ پاکستان کے دوران یا قائدِ اعظم کی زندگی تک ہی محدود نہ تھا اس کے بعد بھی جاری رہا۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد اپنی زندگی کی آخری تصنیف میں (جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی ہے) مسلم لیگ کے متعلق رقم طراز ہیں۔

> فطری طور پر مسلم لیگ کے لیڈر کانگریس کے مطالبۂ آزادی کے خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر انھوں نے کسی ایسے مطالبے کی تائید کی تو برٹش گورنمنٹ سرکاری ملازمتوں اور انتخابی اداروں میں مسلمانوں کو مخصوص مراعات نہیں دے گی۔ وہ دراصل کانگریس کو باغیوں کی ایک غیر وفادار جماعت سمجھتے تھے۔ . . . . . مسلم لیگ کا یہ پروگرام برٹش گورنمنٹ کی خواہش کے عین مطابق تھا۔ درحقیقت ایسا سمجھنے کے کافی قرائن موجود ہیں کہ لیگ برٹش گورنمنٹ کے ایما پر چل رہی تھی۔ (انڈیا ونز فریڈم۔ صفحہ ۱۱)

پھر وہ قائدِ اعظمؒ کی سیاسی عظمت پر حملہ آور ہوتے ہیں اور لکھتے ہیں۔

> اب مسٹر جناح مسلم لیگ کے لیڈر ہو گئے تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ کانگریس اور برٹش گورنمنٹ

کے اختلافات سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ جب کبھی کانگریس اور گورنمنٹ میں اختیارات منتقل کرنے کی گفت و شنید شروع ہوتی تو پہلے وہ خاموش رہتے۔ اگر گفت و شنید ناکام ہوتی تو وہ ایک گرما گرم بیان دے دیتے اور دونوں پارٹیوں کی خبر لیتے اور یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے کہ چونکہ کوئی فیصلہ نہیں ہوا اس لئے برطانیہ کی پیش کش پر مسلم لیگ کو اپنی رائے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں۔ (ایضاً ص۱۱۱)

ازاں بعد تحریک پاکستان کے متعلق فرماتے ہیں۔

کیبنٹ مشن پلان کے ماتحت مشترکہ آزاد ہندوستان میں انگریزوں کو ہندوستان کی صنعتی اور اقتصادی زندگی میں دخیل ہونے کا اتنا موقع نہیں مل سکتا تھا جتنا کہ ملک کی تقسیم کی صورت میں جس میں مسلمانوں کی اکثریت کے صوبے آزاد و خود مختار ہونے تھے۔ اور انگریزوں کو ہندوستان میں اپنے قدم جمانے کا موقع مل سکتا تھا۔ جس ملک میں مسلم لیگ کی حکومت ہو وہاں انگریزوں کو اپنے مستقل اثر کا واضح امکان حاصل تھا۔ اس سے ہندوستان کا طرز عمل بھی متاثر ہوتا۔ پاکستان میں انگریزوں کی موجودگی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ ہندوستان کو انگریزی مفاد کی طرف زیادہ توجہ دینی پڑتی بہ نسبت دوسری شکل کے۔ (ایضاً ص۱۹۲)

ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں۔

یہ سوال عرصے سے دماغوں میں تھا کہ آیا آزادی حاصل کرنے کے بعد ہندوستان برطانوی دولت مشترکہ میں رہے گا یا نہیں۔ کیبنٹ مشن پلان کی رُو سے فیصلہ خود ہندوستان پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ... تقسیم ملک کے باعث حالات میں انگریزوں کے حق میں بڑی تبدیلی ہو جائے گی مسلم لیگ کے مطالبہ کے مطابق ایک نئی اسٹیٹ کے لئے ناگزیر تھا کہ وہ دولت مشترکہ میں رہے۔ اگر پاکستان نے یہ فیصلہ کیا تو ہندوستان کے لئے بھی یہ کرنا لازمی ہوگا۔ لیبر گورنمنٹ نے ان عوامل پر خوب غور کیا ہوگا۔ انھوں نے ہندوستان کو آزاد کرنے کی ضمانت دی تھی لیکن وہ ہرگز یہ بھول نہیں سکتے تھے کہ سیاسی کش مکش میں کانگریس نے ہمیشہ انگریز کی مخالفت اور لیگ نے اس کی امداد کی تھی۔ چنانچہ جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم ہند کی اسکیم اور قیام پاکستان کا منصوبہ پیش کیا تاکہ مسلم لیگ مطمئن ہو جائے تو لیبر وزارت کے بہت سے ارکان کی طرف سے اس کی تائید ہوئی۔ (ایضاً)

اور اس کے ساتھ ہی چند سطور قبل کا یہ ارشاد بھی ملاحظہ فرمایئے۔

لیبر پارٹی نے ہمیشہ کانگریس اور اس کے لیڈروں سے بے حد ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ اور کئی مرتبہ کھلم کھلا اعلان کیا تھا کہ مسلم لیگ ایک رجعت پسند جماعت ہے۔ میرے نزدیک لیبر پارٹی کا مسلم لیگ کے مطالبات کے سامنے ہتھیار ڈال دینا مسلم لیگ کو خوش کرنے کے لئے نہیں بلکہ برطانوی مفاد کی حفاظت کے لئے تھا۔

حقیقتِ حال کیا تھی؟ اپنی اہم ذمہ داریوں سے روگردانی اختیار کرتے ہوئے محض ذاتی عناد، جوشِ انتقام اور شکست خوردہ ذہنیت کے زیرِ اثر مولانا آزاد نے سطورِ بالا میں جو زہر افشانی کی ہے اس کی تائید میں کانگریس کی صفوں سے قائدِ اعظمؒ کا کوئی بدترین ہندو دشمن بھی لب کشائی کی جرأت نہیں کر سکا۔ اس مرحلہ پر ہم مولانا آزاد کی ان بہتان طرازیوں کے جواب میں کچھ عرض کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے بلکہ اس سے کہیں زیادہ یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ملک کی جنگِ آزادی میں قائدِ اعظم مرحوم نے جو انقلاب آفریں کردار پیش کیا اُسے ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح قارئین کے سامنے لے آئیں۔ تحریکِ استخلاصِ ہند اور تحریکِ استقلالِ پاکستان کے سلسلے میں قائدِ اعظم کی معرکہ آرائیوں کی جو تفاصیل بالترتیب قارئین کے سامنے آئیں گی وہ زبانِ حال سے اس حقیقت کی نقاب کشائی کر دیں گی۔ یہی داستانِ جہاد بتائے گی کہ جس وقت مِن چلے جناحؒ نے ہوم رول لیگ کے پلیٹ فارم سے برطانوی سامراج کے ایوانوں میں زلزلہ ڈال رکھا تھا، اُس وقت کانگریس کس آستانِ اقتدار کا طواف کر رہی تھی۔ جب یہی "رجعت پسند" جناحؒ لارڈ سیڈنہم اور لارڈ ولنگڈن جیسے نشۂ اقتدار کے بدمستوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلا رہے تھے، اس وقت مولانا کے انگریز دشمن نیتا سرکاری ایوانوں میں عہدِ وفا استوار کر رہے تھے۔ نہیں بلکہ یہی "فرقہ پرست" جناحؒ جب ہندو مسلم اتحاد کو آزادیٔ ہند کا نشان قرار دے کر برادرانِ وطن سے پیامبرِ اتحاد کا خطاب پا رہے تھے۔ کانگریس کے مہاتما گؤ رکھشا کے لئے تلوار اٹھانے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ نہیں نہیں! یہی "انگریز دوست" جناحؒ جب دوسری عالمگیر جنگ کے دوران بطورِ احتجاج کمانڈر انچیف کی کانفرنس میں شرکت کی دعوت کو ٹھکرا رہے تھے کانگریسی سفیدپوش حکومت کو ان کے خلاف برانگیختہ کرنے کا فخر حاصل کر رہے تھے۔ یہی نہیں بلکہ عین اس وقت جبکہ ایک طرف وائسرائے بہادر کی جنگی کونسل میں شرکت کے جرم کی بنا پر سر سکندر حیات، سر سلطان احمد، مولوی فضل الحق اور بیگم شاہنواز کے خلاف تعزیری اقدام بروئے کار لائے جا رہے تھے۔ دوسری جانب واردھا کے سامری، سابرمتی کے کنارے ویسٹ منسٹر ایبے اور پارلیمنٹ ہاؤس پر بمباری کے فرضی تصور کے پردے میں آقایانِ فرنگ کی جنگی بے سامانیوں پر ہمدردی اور وفاداری کے آنسو بہا رہے تھے۔ ایک قدم اور آگے بڑھیئے! تاریخ ہمارے سامنے ایک اور نقشہ بھی لاتی ہے اور وہ یہ کہ جس وقت کانگریس کے بھان متی کا پورا کنبہ وائسرائیگل لاج میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی مہمان نوازیوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور اس ایوان میں ملتِ اسلامیہ اور اس کے مطالبۂ پاکستان کے خلاف اس دَور کی سب سے شرمناک سازش کے نقشے ترتیب پا رہے تھے۔ یہی ماؤنٹ بیٹن اپنے سیکرٹری کیمبل جانسن سے اس خطرہ کا بھی اظہار کر رہے تھے کہ اگر مسٹر جناحؒ انگریز اور کانگریس کی اس سازش کی بھینٹ چڑھا دیئے گئے تو انہیں سیاسی "شہید" کا مقام حاصل ہو جائے گا۔ یہی نہیں بلکہ جب قائدِ اعظم اور مطالبۂ پاکستان کے خلاف اپنی ذلیل ترین سازش کو مکمل کر کے لارڈ ماؤنٹ بیٹن، مولانا آزاد کو وائسرائیگل لاج کے بند کمرے میں پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے خفیہ راز کو مناسب وقت پر بروئے کار لانے کا منصوبہ بتا رہا تھا عین اسی وقت اسی سازشی انگریز کی مخاصمانہ روش کے خلاف "انگریز کا حامی" جناحؒ مسلم لیگ کونسل پر واضح کر رہا تھا —

> میں نے تمام دلائل ختم کر دیئے۔ امداد و اعانت کے لئے کسی دوسرے ذریعہ کی تلاش کا کوئی فائدہ نہیں۔
> سوائے ملتِ اسلامیہ کے ہمارے لئے کوئی دوسرا ٹریبونل نہیں جس کی طرف ہم رجوع کریں۔ (جناح ص ۱۶۲)

یہ ہے تاریخ آزادی کے محض چند واقعات کی ایک مختصر اور منہ بولتی سی صدائے بازگشت جن کی روشنی میں متحدہ قومیت کے علمبردار بزرگوں کی الزام بازیوں کی حقیقت پوری طرح الم نشرح ہو کر انصاف پسند دنیا کے سامنے آجاتی ہے۔ یہ اہم واقعات اس سلسلۂ مضمون کے مناسب مقامات پر پوری تفصیل سے قارئین کے سامنے آئیں گے اور ان کی روشنی میں کانگریس کی آزادی اور حریت کے بلند بانگ دعوؤں کا جو ڈھول ساری دنیا میں پیٹا گیا ہے اس کا پول بھی پوری طرح کھل جائے گا۔ ہمیں افسوس ہے کہ جنگِ آزادی میں قائداعظم کی معرکہ آرائیوں کے اس باب کی تمہید ہی اس ناگوار الزامی بحث کی نذر ہو گئی۔ بہرحال ہمارے نزدیک یہ اشد ضروری ہے کہ دشمنانِ پاکستان نے اپنی بہتان طرازیوں کی تشہیر میں جس پست ترین حد تک جانے میں باک نہیں سمجھا اور اس سے جو مذموم اثرات ذہنوں میں مرتسم ہو سکتے ہیں انہیں قارئین کی نگاہوں سے اوجھل نہ رکھا جائے۔

کانگریس میں داخلہ

اب ہم براہِ راست اپنے اہم موضوع کی طرف آتے ہیں۔

جنگِ آزادی کی تاریخ اپنے ابتدائی دور کا نقشہ پوری تفصیل سے ہماری نگاہوں کے سامنے لاتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں جب بڑے ہی دھیمے دھیمے سروں میں بڑے عجز و انکسار کے ساتھ کہیں کہیں آزادی کا ایک آدھ نغمہ سنائی دے رہا تھا۔ کانگریس کے اجلاس کلکتہ (۱۹۰۶ء) کے پلیٹ فارم سے ایک نفاست پسند، خوش پوش اور گرم جوش بیرسٹر ابھرتے ہوئے شباب کا بانکپن اور تند و تیز عزم لے کر میدانِ سیاست میں نمودار ہوا۔ اس کا جچا تلا اندازِ بیان، دلنشین آواز، دلائل و براہین کی پختگی، پر اعتماد فکر و نظر — چوٹی کے آزمودہ کار رہنمایانِ ملک نے محسوس کیا کہ بزمِ سیاست ایک انوکھی اور دلآویز شمع کی نور پاشیوں سے جگمگا اٹھی۔ مسٹر گوکھلے اور دادا بھائی نوروجی جیسے عظیم سیاستدانوں نے آگے بڑھ کر اس کا خیر مقدم کیا۔ یہ تھا قائداعظم محمد علی جناحؒ اور یہ تھی کارزارِ سیاست میں اس عظیم سیاستدان کی داستان۔ بہت جلد انھوں نے محسوس کیا کہ انکسار و اعتدال کی مصلحت پسندیوں میں ڈھلا ہوا یہ پلیٹ فارم ان کے بے باک نعروں کا متحمل نہیں ہو سکے گا۔ چنانچہ اس کی لرزتی صداؤں سے ہوم رول لیگ کے پلیٹ فارم کا رخ کر لیا۔ اور اس پلیٹ فارم سے انھوں نے جس جرأت و بے باکی سے امپیریلزم کے لات و منات پر تابڑ توڑ حملے کئے بمبئی کا جناح میموریل ہال اور اس کی ایک ایک اینٹ آج بھی ببانگِ دہل اس کی شہادت دے رہی ہے۔ قائداعظم کی شرکت سے قبل کانگریس کی حیثیت کیا تھی اور اس کے قیام کا مقصد کیا تھا؟ یہ جاننے کے لئے پنجاب کے مشہور کانگریسی رہنما ڈاکٹر ستیہ پال کی ایک مشہور تصنیف سے حسبِ ذیل الفاظ کو سامنے لائیے۔

> مسٹر ہیوم نے کانگریس کی بنیاد رکھی۔ ہندوستان کی بہتری کے لئے نہیں، بلکہ برٹش راج کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لئے ...... مسٹر ہیوم کا کوئی کتنا ہی شکریہ کیوں نہ ادا کرے کہ انہوں نے ایسی تنظیم کی بنا ڈالی جو اپنی کوششوں سے شاہ بلوط کے درخت کی طرح پروان چڑھی۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہر ہندوستانی اس بات کو مدِ نظر رکھے کہ اس کی پشت پر ہندوستان کو بیرونی حکومت کے جوئے سے آزاد کرانے کا مقصد نہ تھا بلکہ مقصد یہ تھا کہ برٹش حکومت کی جڑیں ہندوستان میں اور مضبوط و مستحکم ہوں ..... تاجِ برطانیہ سے وفاداری کانگریس کا مذہبی فریضہ

تھا اور اس کا تعلیم یافتہ طبقہ برٹش طرزِ حکومت کا دلدادہ ... (کانگریس کے ساٹھ سال ص۱۱۱)

چنانچہ اس کے سالانہ اجتماعات میں جو خطبات صدارت پڑھے جاتے تھے ۔ ان میں اس قسم کی یقین دہانی ہوتی تھی کہ

کیا یہ ممکن ہے کہ اس قسم کا اجتماع جس کا ہر فرد برٹش حکومت کی نعمتوں سے واقف ہے، کسی ایسے مقصد کے لئے منعقد ہو سکتا ہے جو حکومت کے خلاف ہو۔ اس حکومت کے جس نے ہم کو یہ سب کچھ عطا کیا ہے ہم کو صاف طور پر یہ اعلان کر دینا چاہیئے کہ ہم سر سے پاؤں تک وفادار ہیں۔ (خطبۂ صدارت دادا بھائی نوروجی)

مسلم لیگ میں شرکت

۱۹۱۳ء میں قائد اعظمؒ مولانا محمد علیؒ اور سر وزیر حسن کی کوششوں سے مسلم لیگ میں شامل ہوئے اور ہر دو جماعتوں کے ممتاز رہنما کی حیثیت سے ان کی یہ انتھک اور مسلسل جدوجہد بروئے کار آئی کہ ہر دو جماعتوں کے باہمی سمجھوتے سے ہندو مسلم اتحاد کا وہ سنگ بنیاد قائم ہو جائے جس پر ملک کی آزادی کے ایوان تعمیر ہو سکیں۔ چنانچہ مسلم لیگ کے اجلاس بمبئی (۱۹۱۵ء) میں ہم ان کا یہ پیغام سنتے ہیں کہ:-

ملک کی دو بڑی جماعتوں نے اپنے سامنے جو مشترکہ نصب العین رکھا ہے اس کو حاصل کرنے کے لئے دونوں کی متحدہ جدوجہد کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اگر دونوں جماعتوں کے نمائندے ایک جگہ جمع ہو کر اس نصب العین کے حصول پر غور کریں تو اس میں کونسی حرج کی بات ہے۔ بمبئی کا یہ اجلاس ہماری تنظیم کا ایک زبردست امتحان ہے۔ اجلاس کی کامیابی گویا مسلمانوں کی تنظیم ان کی وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل کا زندۂ جاوید ثبوت ہے۔ علاوہ ازیں ہم اپنے ہندو ہموطنوں کو دکھا دیں گے کہ سیاسی میدان میں بھی ہم ان کے ساتھ پہلو بہ پہلو چل سکتے ہیں، یہی ایک صورت ہے جس سے ہم حکومت پر ... واضح کر سکتے ہیں کہ جس چیز کا ہم مطالبہ کر رہے ہیں حقیقتاً ہم اس کے اہل بھی ہیں۔ (قائد اعظم محمد علی جناحؒ - ص۹۶)

یہ وہ دور تھا جب برطانیہ عظمیٰ کے جاہ و جلال کا سکہ چاروں طرف بیٹھا ہوا تھا۔ دلوں پر خوف و ہراس کے پہرے تھے اور زبانوں پر سکوت کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔ چنانچہ اس دور میں اگلے ہی سال انہوں نے بمبئی پراونشل مسلم لیگ کانفرنس میں اپنے صدارتی خطاب میں اعلان کیا۔

اس وقت ہمارے سامنے ایک ہی چیز ہے اور وہ یہ کہ سب سے پہلے موجودہ دفتری حکومت سے قوت چھین کر جمہوری حکومت کے سپرد کر دیں۔ ہماری ساری توجہ اب اسی مقصد پر مرکوز رہنی چاہیئے۔ حالات اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان متحدہ طور پر اس تبدیلی کو جلد از جلد معرض وجود میں لانے کی کوشش کریں ..... تیس کروڑ ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ آواز میں اتنی قوت ہوگی کہ وہ دنیا کی ہر چیز کا مقابلہ کر سکے گی۔ ہندوستان ایک نئی کروٹ لے رہا ہے۔ ہم صدیوں سے مصائب و آلام سے دوچار چلے آ رہے ہیں مگر ہم نے صبر و استقلال سے کام لیا ہے۔ ہمارا شاندار مستقبل اب بہت قریب ہے۔ ہم صراطِ مستقیم پر قدم بڑھا رہے ہیں، اور

منزلِ مقصود سامنے نظر آ رہی ہے۔ (ایضاً صـ ۱۰۲-۱۰۱)

پیامبرِ اتحاد ۱۹۱۶ء قائدِ اعظمؒ کی زندگی میں ایک یادگار اور ناقابلِ فراموش مرحلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی سالہا سال کی مسلسل اور ان تھک کوششوں کے باعث کانگریس اور مسلم لیگ لکھنؤ میں اکٹھی ہوئیں اور "لکھنؤ پیکٹ" کے نام سے وہ تاریخی سمجھوتہ معرضِ وجود میں آیا جس نے دو بڑی قوموں کو شانہ بشانہ آزادی کی منزل پر گامزن ہونے کا امکان عطا کیا۔ قائدِ اعظم اب پورے ملک کے زعیم تھے۔ اس عظیم کارنامے کا سہرا انہیں کے سر بندھا۔ وہ "سفیرِ اتحاد" اور "پیامبرِ اتحاد" کے خطابات سے نوازے گئے۔ شہرت کے آسمان پران کا نام ستارۂ صبح کی طرح جگمگا رہا تھا۔ لکھنؤ کے اس یادگار اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا۔

> زمانۂ قدیم میں جس کسی نے جنگ لڑی اور آزادی حاصل کی وہی آزادی کے اہل سمجھے گئے مگر آج کا دور اس زمانے سے مختلف ہے۔ اب فتح و نصرت صلح سے بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ ہم صرف آئینی جنگ لڑنا چاہتے ہیں۔ اس جنگ میں ہم ہر ممکن جدوجہد سے کام لیں گے اور ہر قسم کی قربانیاں پیش کریں گے۔ ہم سلطنتِ برطانیہ پر اس حقیقت کو واضح کر دیں گے کہ اس سلطنت میں "ہندوستان" ایک شریک کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ہمارا کم سے کم سیاسی مقام ہوگا۔...... سیاسی منزل تک پہنچنے کے لئے ہندو مسلم اتحاد ایک مشعلِ راہ ہے۔ ہماری کامیابی کا سارا انحصار ان دونوں کے خوشگوار اتحاد پر مبنی ہے۔ (ایضاً)

انہی ایام میں بمبئی پریذیڈنسی ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام حکومت کی متشددانہ پالیسی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لئے ایک عظیم الشان اجتماعِ عام ہوا۔ اس اجلاس کی مسندِ صدارت سے بمبئی کے عوام کو مخاطب کرتے ہوئے اس بے باک زعیم نے پہلے حکومت کی متشددانہ پالیسی کی وضاحت کی اور پھر فرمایا۔

> سمجھ میں نہیں آتا کہ پوری سلطنتِ برطانیہ میں صرف ہندوستان سے یہ سلوک کیوں روا رکھا جا رہا ہے ہندوستان نے جنگِ عظیم میں جان و مال کی قربانیاں دی ہیں اور سلطنت کا تحفظ کیا ہے۔ یہ جنگ مختلف ملکوں کی آزادی و استقلال کی بقا کے لئے لڑی جا رہی تھی۔ کیا دفتری حکومت اندھی تھی؟ کیا اربابِ حکومت فاتر العقل تھے؟ کہ انھوں نے وفادار ہندوستانیوں سے یہ سلوک روا رکھا حکومت کا یہ طرزِ عمل اس کے ذہنی اور سیاسی افلاس کا نشان ہے۔ ہز ایکسیلینسی لارڈ چمسفورڈ اس وقت کیا کر رہے تھے۔ ایسی فضا میں ان کی خاموشی نہ صرف منحوس تھی بلکہ صوبائی حکومتوں کی متشددانہ پالیسی سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ (ایضاً)

مہاتما جی کا نیا روپ عین اس وقت جب قائدِ اعظمؒ کی شبانہ روز جدوجہد کی بدولت کانگریس اور مسلم لیگ نے باہمی اتحاد کی خوشگوار فضا میں آگے بڑھنا شروع کیا۔ مہاتما تلک کی گئو رکھشا کے نام پر بھڑکائی ہوئی آگ جو کچھ مدت سے سرد پڑ چکی تھی ایک بار پھر شعلہ زن ہو گئی۔ اور حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس راکھ کو ازسرِ نو ہندو مسلم فساد کے شعلوں کی صورت میں بھڑکانے والے ہاتھ کسی فرقہ پرست ہندو مہاسبھائی کے ہاتھ نہیں تھے بلکہ (یہاں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ) یہ شرف "مہاتما گاندھی" کے مقدس ہاتھوں کو حاصل ہونا تھا۔ اس

ضمن میں انہوں نے جریدہ اسٹیٹسمین کو وہ مشہور خط لکھا جس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:۔

میں جانتا ہوں کہ ہندوؤں کا غصہ اس وقت انگریزی راج کی دھاک میں دبا ہوا ہے۔ مگر ملک بھر میں کوئی بھی ایسا ہندو نہیں جو اس بات کا تمنی نہیں ہے کہ اس ملک کو ایک دن گاؤکشی سے پاک کرنا ہوگا۔ گو یہ چیز ہندو دھرم کے خلاف ہے مگر اس معاملہ میں ہندو تشدد سے کام لے گا اور عیسائیوں اور مسلمانوں کو تلوار کے زور پر گاؤکشی ترک کرنے پر مجبور کرے گا۔

مہاتماجی کے اس اعلان نے ہندو مسلم فسادات کی آگ کو جو ہوا دی۔ اس کی تفصیل تاریخ کا ایک مستقل ورق ہے اور اس سے وہ تمام نقاب اُلٹ جاتے ہیں جو اہنسا، پریم اور شانتی کے دلفریب الفاظ سے بروئے کار لائے جاتے ہیں۔

ایک طرف مہاتماجی یہ کھیل کھیل رہے تھے اور آزادی کی جس منزل کے بارے میں قائدِ اعظمؒ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو یہ امید دلائی تھی کہ وہ سامنے نظر آرہی ہے اُسے نگاہوں سے اوجھل کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے، اور دوسری طرف یہ سفیر اتحاد" جنگی کانفرنس کے اجلاس (۱۹۱۷ء) میں وائسرائے بہادر کے سامنے یہ دوٹوک اعلان کر رہا تھا کہ جب تک ہندوستانیوں کی سیاسی آزادی کا نقشہ انہیں پوری طرح سمجھا یا نہیں جائے گا اس وقت تک وہ جنگی مسائل میں شریک کار بننے سے اجتناب کریں گے۔

اس سلسلہ میں یہ واقعہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ دلّی کی اسی جنگی کانفرنس کے سلسلے میں جہاں قائدِ اعظمؒ نے مذکورہ اعلان کیا وہاں گاندھی جی نے اپنے ایک انگریز دوست کی وساطت سے وائسرائے کو ایک خط بھیجا۔ اور اس خط میں انہوں نے تحریر فرمایا:۔

میں اپنے ملک والوں کو آمادہ کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ تحریک آزادی کے سلسلہ میں اپنے بڑھے ہوئے قدم پیچھے ہٹالیں۔ میں کانگرس کو تمام ریزولیوشنز واپس لینے کا مشورہ دوں گا اور دورانِ جنگ میں ہوم رول یا ذمہ دار حکومت کا نام بھی نہ لوں گا۔ میں کوشش کروں گا کہ مادرِ ہند کا ہر تندرست سپوت سلطنت کی حرمت پر کٹ مرے۔ (حیاتِ محمد علی)

آئینِ جواں مرداں

ایک طرف کانگریس کے سب سے بڑے راہ نما پرائیویٹ چھٹیوں میں وفاداری اور سرپرستی کا یہ کھیل کھیل رہے تھے اور دوسری طرف دہلی کی مرکزی اور بمبئی کی پراونشل جنگی کانفرنسوں میں قائدِ اعظم کی وہ گرج سنائی دے رہی تھی جس نے سامراج کے ایوانوں میں تہلکہ ڈال رکھا تھا۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ بمبئی کے مغرور اور اکڑ باز گورنر لارڈ سیڈنہم کو جو ہندوستانیوں کی توہین و تذلیل میں بڑا سرگرم تھا۔ قائدِ اعظمؒ نے بمبئی کے جلسۂ عام میں کس بے باکی سے چھٹی کا دودھ یاد دلایا تھا۔ لارڈ سیڈنہم کے بعد لارڈ ولنگڈن بمبئی کا گورنر مقرر ہوا۔ جو غرور اور اکڑ بازی کے لحاظ سے لارڈ سیڈنہم سے بھی چار قدم آگے تھا۔ اس نے مسلم لیگ کے بمبئی کے سالانہ اجلاس میں زر خرید غنڈوں کے ذریعہ گڑبڑ پھیلا کر اپنی بد دماغی اور سازشی کردار کی ایک نئی اور شرم انگیز مثال قائم کر دی تھی۔ چنانچہ اس پُر غرور روش اور غیر ذمہ دارانہ حرکات کے ساتھ ہی قائدِ اعظم سے اس کی چپقلش کا آغاز ہو گیا۔ ہوم رول لیگ کے پلیٹ فارم سے قائدِ اعظمؒ نے اُسے آڑے ہاتھوں لیا۔ اسی دوران میں یکم جون ۱۹۱۸ء کو لارڈ ولنگڈن نے صوبائی وار کانفرنس کا اجلاس طلب کیا۔ قائدِ اعظمؒ بھی اس اجلاس

میں ہوم رول لیگ کے قائد کی حیثیت سے موجود تھے۔ جنگِ عظیم کا دور دورہ تھا۔ ہنگامی اور غاصبانہ قوانین نے چاروں طرف خوف و ہراس کی فضا پیدا کر رکھی تھی۔ اور اس وحشت انگیز دور میں ادنیٰ سی جرأت مندانہ حرکت بدترین خطرے کی دعوت تھی۔

یہ تھا وہ ہیبت ناک ماحول جس میں لارڈ ولنگڈن نے اپنے صدارتی خطاب کا آغاز کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کبر و نخوت اور وحشت و بربریت کا کوئی مغرور دیوتا غیظ و غضب کی آگ سینے میں لئے لب کشائی پر اتر آیا۔ آغازِ تقریر میں ہی اس نے فرعونی انداز میں ہوم رول لیگ کے رہنماؤں کی نیت پر حملہ کیا۔ کچھ دھمکیاں دیں۔ کچھ ڈانٹ پلائی۔ اور جب یہ یقین ہو گیا کہ اپنی ہیبت کا سکہ پوری طرح بٹھا لیا اور اب کوئی پر نہیں مار سکتا تو تقریر ختم کرتے ہی فی الفور قائدِ اعظم کو تقریر کی دعوت دی۔ یہ تھا ایک سالارِ انقلاب کی آزمائش کا کڑا مرحلہ۔۔۔۔۔۔

قائدِ اعظمؒ تقریر کے لئے اٹھے۔ اپنی مخصوص شانِ بے نیازی اور مجاہدانہ وقار کے ساتھ اسٹیج پر پہنچے اور بلاخوف لومتہ لائم اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا۔

> مرحلہ کتنا ہی نازک کیوں نہ ہو ہر ہندوستانی اس پر متفق ہے کہ ہندوستان کو سیاسی میدان میں آگے بڑھنا چاہیئے۔ قبل اس کے کہ میں آگے بڑھوں اس قلبی اذیت کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ ہز ایکسیلینسی ہوم رول لیگ کے رہنماؤں کے خلوص و صداقت کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ مجھے اس طرزِ کلام اور روش پر انتہائی افسوس ہے ۔۔۔۔۔ اور ہز ایکسیلینسی کے احترام کے باوجود میں اس طرزِ عمل کے خلاف اظہارِ احتجاج کرتا ہوں۔ ہم اپنے ملک کے دفاع کے لئے بے چین ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ حکومت سپاہیوں کی بھرتی چاہتی ہے اور ہم "نیشنل آرمی" کا قیام چاہتے ہیں۔ یہی فرق ہے ہم دونوں میں۔ ہمارے نزدیک جرمن خطرہ "سپاہی" دور نہیں کر سکتے۔ یہ صرف نیشنل آرمی کر سکتی ہے ۔۔۔۔۔ ہم اس وقت تک حکومت کی کوئی مدد نہیں کر سکتے جب تک ہمیں اعتماد میں نہ لیا جائے اور شریکِ کار نہ بنایا جائے۔ (حیاتِ محمد علی)

جون ۱۹۱۸ء میں لارڈ ولنگڈن سے یہ جھڑپ ہوئی اور چھ ماہ بعد ۱۱ دسمبر کو لارڈ موصوف سے وہ تاریخی ٹکراؤ منظرِ عام پر آیا جس میں قائدِ اعظمؒ کے مظاہرۂ حریت نے پورے ملک سے خراجِ تحسین وصول کیا۔ تحسین و آفرین کے والہانہ جوش میں بمبئی کے لاکھوں شہری انہیں پیامبرِ اتحاد کے خطاب سے یاد کر رہے تھے اور جناح میموریل ہال کی تعمیر اس مظاہرۂ عقیدت کی عملی تشکیل میں منظرِ عام پر آ رہی تھی۔

اس معرکہ آرائی کی تفصیل پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ اس تاریخی مرحلہ پر ہم قائدِ اعظم کے عوام کے نام اس یادگار پیغام کو ایک بار پھر دہراتے ہیں ۔۔۔۔

> آپ کی مساعیٔ جمیلہ نے یہ حقیقت پوری طرح واضح کر دی کہ نوکر شاہی اور مطلق العنانی مل کر بھی آپ کو خوف زدہ نہیں کر سکتیں۔ ۱۱ دسمبر کا دن بمبئی کی تاریخ میں جشن کا دن ہے۔ جائیے اور خوشیاں منائیے۔ آج جمہوریت کی فتح اور سربلندی کا دن ہے۔ (ایضاً)

تجناح میموریل" کے قیام کے سلسلے میں اس فاتحانہ مرحلہ پر "بمبئی کرانیکل" میں مسٹر پی ڈی لام کی جو اپیل شائع ہوئی۔ اس کے یہ الفاظ بمبئی کے لاکھوں شہریوں کے دلوں کی آواز تھے۔

کوئی شخص اگر "میموریل" کا مستحق ہے تو وہ صرف مسٹر جناح ہیں۔ جن کی بلند حوصلگی اور بے خوف قیادت نے قومی زندگی میں حقیقتاً ایک نئے دور کا آغاز کر دیا ہے۔ مسٹر جناح کے عزم صمیم میں ہمارے مرحوم لیڈروں دادا بھائی نوروجی اور گوپال کرشن گوکھلے کی روح جلوہ گر نظر آتی ہے..... انھوں نے عوام کے حقوق کی راہنمائی کی ہے اور ایک عظیم المرتبت محبِ وطن کی حیثیت سے ان کا نام ہمیشہ ہمارے دلوں میں تر و تازہ رہے گا۔ مسٹر جناح ہر اعتبار سے ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں اور ایک میموریل کے بجا طور پر مستحق ہیں۔ (حیاتِ محمد علی)

قائدِ اعظم کے یہی زندہ جاوید معرکے تھے جن کا اعتراف کرتے ہوئے مہاتما گاندھی کو بھی "ہریجن" کی ۷ اکتوبر ۱۹۳۹ء کی اشاعت میں یہ لکھنا پڑا۔

مسلم لیگ ایک عظیم المرتبت آرگنائزیشن ہے اس کا صدر (قائدِ اعظمؒ) ایک وقت میں کانگریس کا پرجوش حامی تھا اور اس سے ہماری بہترین امیدیں وابستہ تھیں لارڈ ولنگٹن سے اس کی معرکہ آرائیاں کبھی فراموش نہیں کی جا سکتیں۔

لارڈ ولنگٹن سے نبرد آزمائی کا دور ابھی بمشکل ختم ہوتا ہے کہ ابتلاؤ آزمائش کی ایک نئی اور کٹھن منزل کاروانِ حریت کے سامنے آجاتی ہے۔ یہ منزل تھی ہنگامی اور متشددانہ قوانین کے سلسلے میں رولٹ ایکٹ جیسے رسوائے عالم "سیاہ قانون" کا لفاذ۔ یہ ایکٹ اپنی ہمہ گیر ظالمانہ گرفت کے لحاظ سے ملک کے ہر محبِ وطن اور آزادی پسند گوشے کے لئے ایک ناروا چیلنج سے کم نہ تھا۔ پورا ملک اس ایکٹ کی گھناؤنی جزئیات کے خلاف سراپا احتجاج نظر آتا تھا۔ قائدِ اعظمؒ نے عوام کی دھڑکنوں کو بجا طور پر محسوس کیا۔ وہ ان کی نمائندگی کے لئے مردانہ وار آگے بڑھے اور امپیریل کونسل میں ان کے نعرۂ حق کی صدائے بازگشت وائٹ ہال تک سنا دی۔ انہوں نے کہا۔

سارے معاملہ کو ایک ایسی مخصوص روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جیسے اچانک ہم میں سے کوئی جرائم پیشہ قبائل اٹھ کھڑے ہوں۔ اور عظیم خطرات کا پیش خیمہ بن گئے ہوں ایسا نظر آتا ہے کہ بلا سوچے سمجھے اس سلسلے میں ہر شخص نے قانون سازی کو اپنا فرض اوّلین قرار دے لیا ہو، اور رجسٹر قوانین میں اس کا اندراج کرنے کے بعد اس مسئلہ کو حل کر لیا ہو۔ میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ خواہ کتنے ہی قوانین وضع کر کے رجسٹر قوانین میں درج کر لیں وہ اس مسئلہ کا حل ثابت نہیں ہو سکتے۔ ان وجوہات سے نجات حاصل کرنے کے لئے آپ کو کافی حد تک اپنی پالیسی تبدیل کرنی پڑے گی۔ (قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ)

اس تقریر کے بعد وہ ایک قدم آگے بڑھتے ہیں اور کونسل سے اپنا استعفےٰ پیش کر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں وائسرائے بہادر کے نام ان کا اہم خط ہماری جنگِ آزادی کی ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس خط میں انہوں نے لکھا۔

حکومتِ ہند نے اور آپ نے زمانۂ امن میں ایک ایسی چیز کو جسٹر قوانین میں شامل کرنا مناسب سمجھا ہے جو حقیقتاً نفرت انگیز اور بلا خوفِ تردید تشدد آمیز ہے۔ علاوہ ازیں یہ بل پاس کر کے آپ کی حکومت نے اس تمام استدلال پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا ہے جو جنگی کانفرنس میں مدد کے لئے ہندوستانیوں سے اپیل کرتے وقت پیش کیا گیا تھا۔ آپ نے ان تمام اصولوں کو پاؤں تلے روند دیا ہے جن کے لئے حکومتِ برطانیہ نے جنگ لڑی تھی۔

انصاف کے بنیادی اصولوں کا عین اس وقت استیصال کیا گیا ہے اور عوام کے آئینی حقوق پر عین اس وقت ڈاکہ ڈالا گیا ہے۔ جب حکومت کو حقیقتاً کسی بھی خطرے کا سامنا نہیں ......

ان حالات کے درمیان میں اپنے رائے دہندگان کے لئے کونسل میں ایک عضوِ معطّل کی حیثیت رکھتا ہوں۔ علاوہ بریں ایک ایسے شخص کے لئے جو عزتِ نفس کا احساس رکھتا ہو ایک ایسی حکومت کے ساتھ جو عوام کے نمائندوں کی رائے کو نہ تو کونسل میں کوئی اہمیت دیتی ہو اور نہ ہی اُسے عوام کے جذبات کا کوئی احترام ملحوظ ہو تعاون کرنا امرِ محال ہے۔

میری رائے میں ایک ایسی حکومت جو زمانۂ امن میں ایسے قوانین پاس کرتی ہے۔ مہذب حکومت کہلانے کی مستحق نہیں۔

قائدِ اعظمؒ جیسے دور اندیش حکیمِ سیاست کا استعفےٰ عوام کے ہیجان و اضطراب اور غیظ و غضب کا ترجمان تھا۔ اس ہیجان و اضطراب نے مظاہروں کی صورت اختیار کر لی جلسوں اور جلوسوں کا ملک گیر سلسلہ شروع ہو گیا۔ جنگِ عظیم کی فتح کے نشے میں بدمست ہو کر حکومت کے کارندے وحشت و بربریت کے مظہر بن کر میدان میں نکل آئے اور جن عوام کی قربانیوں سے جنگِ عظیم کی شکست سے فتح کا منہ دیکھنا نصیب ہوا تھا انہی کے خلاف مشین گنوں کے منہ کھول دیئے اور ساتھ ہی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی جھنکار سے فضا میں ایک تہلکہ سا بپا کر دیا۔ جلیانوالہ باغ کا اندوہناک حادثہ اسی ظلم اور بربریت کا شاہکار ہے جہاں دیکھتے ہی دیکھتے جنرل ڈائر کی درندگی نے سینکڑوں بے گناہوں کو خاک و خون میں تڑپا کر رکھ دیا۔ برطانوی سامراج کی وحشت اور درندگی کے اس جگر پاش اقدام نے پورے ملک کی فضا میں غم و غصہ کی بجلیاں دوڑا دیں۔ قائدِ اعظمؒ جو پہلے ہی رولٹ ایکٹ کے خلاف تلملائے بیٹھے تھے گرج کر بولے :-

رسوائے عالم صدر رولٹ کمیٹی کے "مشاورتی تیسرا" میں وضع کئے ہوئے قوانین جن پر لارڈ چیمسفورڈ کی حکومت نے عمل درآمد شروع کیا ہے۔ ایسے ہیبت ناک جرائم پر منتج ہوئے ہیں جن کو نہ تو کوئی آنکھ بیان کر سکتا ہے اور نہ عورتوں کے اشکوں کی روانی انہیں دھو سکتی ہے۔ انہیں اپنے اس فیصلے کی قیمت آج نہیں تو کل ضرور ادا کرنی پڑے گی۔ کم از کم ایک بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ موجودہ طرزِ حکومت ناقابلِ برداشت ہے اور اس کی جگہ ایک مکمل ذمہ دارانہ حکومت ہونی چاہئیے۔ اس سلسلہ میں کانگریس اور لیگ کے اجلاس زیادہ مؤثر ثابت نہیں ہوں گے۔ سیکرٹری آف اسٹیٹ کو احتجاجی ریزولیوشن بھیجنے کے بجائے کوئی مؤثر لائحہ عمل وضع

کرنا ہوگا۔ یقیناً ہمیں وہی ذرائع اختیار کرنے پڑیں گے جو فرانس، اٹلی اور مصر میں بروئے کار لائے گئے۔

(قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ)

خراجِ تحسین

قومی زندگی کے انتہائی نازک مرحلوں اور وحشت ناک فضا میں قائدِ اعظمؒ کی حق گوئی و بے باکی کی یہ جرأت آفریں داستان تاریخِ آزادی کا ایک درخشندہ باب ہے۔ ان کے یہ نعرہ ہائے حریت کسی جذباتی اور ہنگامہ پسند طالع آزما کی آتش بیانیوں کے مترادف نہیں بلکہ یہ ایک دور اندیش اور حقیقت پسند حکیم سیاست کی صدائے حق تھی جس نے ملک و ملت کی نمائندگی اور قیادت فریضہ شایانِ شان جرأت سے ادا کیا۔ ان کے تدبّر اور فراست کے بھی وہ بے مثال شاہکار تھے جنہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے گوپال کرشن گوکھلے جیسے عظیم رہنما نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ:-

ہندوستان کو جب بھی آزادی نصیب ہوئی وہ جناح ہی کے دماغ کی بدولت ہوگی۔

(حیاتِ محمد علی)

اس دوران میں ایسے مرحلے بھی آئے جب حکومتِ برطانیہ نے انہیں مختلف ذرائع سے خریدنے کی کوشش کی۔ (یہ بجائے خود ایک قابلِ ذکر داستان ہے لیکن مضمون کی طوالت کے پیشِ نظر ہم اس سے متعلق واقعات کی تفصیل سے گریز اختیار کر رہے ہیں) ان کی اسی رفعتِ کردار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسز سروجنی نائیڈو نے برملا اعتراف کیا تھا کہ:-

میں بڑی مدت سے مسٹر جناح کو جانتی ہوں۔ ان کے بارے میں خواہ کوئی رائے بھی قائم کی جائے لیکن میں یہ پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ ان کو کسی قیمت پر بھی خریدا نہیں جا سکتا۔

(MY LEADER BY Z.A. SULEHRI)

رولٹ ایکٹ جیسے متشددانہ قوانین کے نفاذ اور جلیانوالہ باغ کی فائرنگ جیسے دلدوز حادثات نے ملک کی داخلی سیاسیات میں غم و غصہ کی آگ بھڑکا رکھی تھی کہ خلافت ترکیہ کے خاتمہ نے ہیجان و اضطراب کا ایک نیا طوفان بپا کر دیا۔ ترکی جنگِ عظیم میں شکست کھا چکا تھا اور اس کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہوئے حکومتِ برطانیہ نے ان تمام وعدوں کو پاؤں تلے روند دیا، جو اسلامیانِ ہند سے کئے گئے تھے۔ خلافت کی تباہی اور ترکی پر اتحادیوں کے قبضے نے یہاں کے مسلمانوں کے زخموں پر نمک چھڑک دیا اور ان کے اس اضطراب نے تحریکِ خلافت کا رنگ اختیار کرتے ہوئے ملک کے طول و عرض میں جوش و خروش کے ہنگامے برپا کر دیئے۔ اسلامیانِ ہند اور ان کے گرم جوش لیڈر تحریکِ خلافت اور تحریکِ ہجرت کے جوش میں اس قدر آپے سے باہر ہو گئے کہ انہیں دوست اور دشمن میں امتیاز کرنے کی شدھ بدھ نہ رہی۔

گاندھی جی

تاریخ اس ہنگامہ خیز اور نازک مرحلے میں "گاندھی جی" اسلام اور مسلمانوں کی ہمدردی کا نقاب اوڑھ کر آگے بڑھے، اور اپنی ساحرانہ اداؤں سے اس پوری تحریک کو اپنے دامِ تزویر میں سمیٹ لیا اور اس کے بعد تحریکِ خلافت کے سرپرست بن کر عدم تشدد اور ترکِ موالات کے ایسے ایسے دلکش جام گردش میں لائے کہ سر پھرا اور گرم جوش مسلمان اپنی تیرہ سو برس کی تاریخ کو بھول گیا۔ اہنسا اور ستیہ گرہ کی میٹھی میٹھی لوریوں میں اس نے ایسے ایسے سہانے خواب دیکھنے شروع کر دیئے کہ بدروحنین اور قادسیہ و یرموک کے جہاں آزا واقعات اور ان کی روحِ جہاد سے بے گانگی اختیار کر لی۔ تحریکِ خلافت اور نیشنل کانگریس اب پوری طرح گاندھی جی کے اشاروں پر رقص کر رہی تھیں اور آزادی

کے حصول کے لئے قومی جدوجہد کا قافلہ ایک نئی اور عجیب و غریب منزل پر قدم بڑھا رہا تھا۔

بروقت انتباہ

قائداعظم نے عوام کو اس دامِ فریب سے خبردار کرنے کی پوری کوشش کی اور جب یہ جادو نہ ٹوٹ سکا تو ایک سچے اصول پسند کی طرح وہ دامن جھاڑ کر کانگریس سے الگ ہو گئے۔ کانگریس کے پلیٹ فارم سے مسلسل پندرہ برس تک ہندو مسلم اتحاد کے سہارے آزادی کی منزل تک پہنچنے کا انتھک مدعی اب سیاست کی دہائی شعبدہ بازیوں سے دامن کش کھڑا تھا۔ لیکن آزادی کی تڑپ اور خلش اُسے اب بھی بدستور طلسم پیچ تاب بنائے ہوئے تھی۔ ذہنی کشمکش نے اسی مرحلے پر انہیں ۱۹ فروری ۱۹۲۱ء کو سروینٹس آف انڈیا سوسائٹی بمبئی کے پلیٹ فارم سے اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی۔ تاریخ نے ان کی اس تقریر کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اس تقریر کے دوران انھوں نے انتہائی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے فرمایا۔

> مجھ سے خواہش کی گئی ہے کہ موجودہ نازک صورتِ حال کے پیشِ نظر میں اپنی خاموشی کی وجہ بیان کروں۔ میں جانتا ہوں کہ موجودہ سیاسی حالت بلاشبہ پُرخطر ہے۔ ایک طرف ہماری حکومت ہے جو جرأت سے اعلانیہ طور پر ایک ایسی پالیسی پر عمل پیرا ہے جس نے ہندوستانیوں کی خودداری کو زبردست صدمہ پہنچایا ہے۔ میرے خیال میں ہر شخص نے جسے ذرا بھی سیاسی بصیرت حاصل ہے حکومت کی پالیسی کی مذمت کی ہے۔ جنگِ عظیم میں ہندوستانیوں نے خون بہایا اور اپنی دولت قربان کی۔ مگر صلح کے بعد انہیں جو انعام بلاوہ رولٹ بل تھا۔ (بمبئی کرانیکل ۲۱ فروری ۱۹۲۱ء)

اور پھر اپنا نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

> میں نے کئی مرتبہ اپنے آپ سے یہ سوال کیا ہے کہ ایسی حالت میں آخر کیا کرنا چاہیئے؟ میں پورے خلوص اور دیانتداری کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں اور مجھے اس پر کامل یقین ہے کہ گاندھی جی کا گو میں بہت مداح ہوں اور میرے دل میں ان کا بہت احترام ہے۔ مگر ان کا پروگرام آپ کو غلط راستہ کی طرف لے جا رہا ہے۔ . . . . . میرے خیال میں آپ کا نقطۂ نظر ایسی سیاسی تحریک ہونا چاہیئے جس کی بنیاد ان سیاسی اصولوں پر ہو جس کی آگ مادرِ وطن کے سینے میں سلگ رہی ہے۔ جب تک اس تحریک کی بنیاد ان اصولوں پر نہیں رکھی جائے گی پروگرام میں سقم باقی رہے گا۔ (ایضاً)

اس کے بعد انہوں نے ایک مردِ مومن کی حیثیت سے اپنا موقف پیش کیا اور فرمایا۔

> حکومت کا مقابلہ کرنے کے لئے کسی ملک کے لئے سب سے مقدم چیز فوجی طاقت کا جمع کرنا ہے۔ جرمنی نے میدانِ جنگ میں آنے سے پہلے چالیس سال تک فوجی تیاری کی۔ ہندوستان میں آخر کون سی فوجی تیاری کی گئی؟ ——— اور کون سی فوجی طاقت ہمارے پاس ہے۔ گاندھی جی نوجوانوں سے کہہ رہے ہیں کہ اسکولوں اور کالجوں سے نکل کر دیہات میں پھیل جائیں۔ آخر کس لئے۔ . . . . . ترکِ موالات اور عدم تشدد کے نظریات سے اگر آپ کامیاب ہو گئے تو یہ ایک معجزہ ہو گا۔ (ایضاً)

دامِ فریب کا شکار

قائدِ اعظم کی اس بروقت حقیقت کشائی سے بھی جوشیلے مسلمانوں کی آنکھیں نہ کھل سکیں۔ چنانچہ موپلا قوم اسی جوش و خروش میں جبر و تشدد کی بھٹیوں میں بھسم ہو کر رہ گئی۔ علی برادران کی معیت میں گاندھی جی اسلامیانِ ہند کے واحد تعلیمی مرکز علی گڑھ کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے لئے آگے بڑھے اور اسے تہہ و بالا کرنے میں پوری قوت صرف کر دی۔ لیکن تاریخ کے اوراق اس حقیقت کو بھی اپنے دامن میں محفوظ رکھے ہوئے ہیں کہ عین اس وقت جبکہ مسلمانوں کے یہ ہمدرد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو ملیامیٹ کرنے کی سازش بروئے کار لا رہے تھے۔ ان کے اپنے دست راست، پوجیہ پاد پنڈت مالوی جی بنارس ہندو یونیورسٹی میں پرنس آف ویلز کے خیر مقدم کی تیاریوں میں دن رات ایک کر رہے تھے اور کسی نے مہاتما جی سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ پنڈت مالوی جی اور بنارس یونیورسٹی سنتیہ گرہ کے موزہ پروگرام سے کس مصلحت کی بنا پر الگ رکھے گئے ہیں۔

قائدِ اعظم کی پیش گوئی حرف بحرف درست ثابت ہوئی۔ گاندھی جی کو انتہائی ناکامی سے اپنی تحریک واپس لینی پڑی۔ ان کے اس اعترافِ شکست سے ہندوؤں کو تو کوئی خاص نقصان نہ پہنچا۔ لیکن مسلمانوں کو اپنی گرم جوشیوں کی کافی سزا بھگتنی پڑی۔ موپلا بغاوت، تحریکِ خلافت کے عظیم جانی و مالی نقصانات نے مسلمانوں کی توانائیاں مضمحل کر کے رکھ دیں۔ ان کی اجتماعی قوتِ عمل شل ہو کر رہ گئی۔ قائدِ اعظم نے یہ سب کچھ دیکھا۔ قوم نے ان کی پکار کو نہ سنا، اور جذباتی سیاست کا شکار ہو کر رہ گئی۔ قائدِ اعظم اب کانگریس سے الگ ہو چکے تھے۔ ہمسا اور سنتیہ گرہ کی تحریکوں کا انجام ان کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس لاہور (منعقدہ ۱۹۲۴ء) کے خطبۂ صدارت میں انھوں نے ایک بار پھر ملک کو مخاطب کیا۔ انھوں نے نہ تو گاندھی جی کی شکست پر کوئی ادنیٰ طنز کی۔ نہ اپنی ملت سے شکوہ و شکایت کی کوئی ضرورت محسوس کی۔ ان کا پورا خطبہ متانت، سنجیدگی، فرض شناسی اور حسنِ تدبر کا شاہکار تھا۔ سب سے پہلے انہوں نے گذشتہ صورتِ حال کا تجزیہ کیا اور پھر فرمایا۔

> آپ میرے ساتھ اتفاق کریں گے کہ اس وقت ہمیں اچھے حالات کا فائدہ اٹھانا چاہیئے اور بُری باتوں کو بھول جانا چاہیئے۔ گذرے ہوئے واقعات کی روشنی میں آئندہ لائحہ عمل وضع کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے پیشتر ہم سے لاتعداد غلطیاں سرزد ہو چکی ہیں اور ان کے باعث ہم کافی نقصان اٹھا چکے ہیں۔ مگر ان لغزشوں سے بہت سی مفید باتیں بھی معرضِ وجود میں آئی ہیں۔ ان تین سال کی جدوجہد ہی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے سامنے سوراج حاصل کرنے کے لئے ایک وسیع میدان ہے۔ عوام میں سیاسی شعور پیدا ہو چکا ہے اور ہر شخص کو احساس ہے کہ کسی ملک کے باشندوں کی خودداری اور عزتِ نفس اس امر کی مقتضی ہے کہ اس ملک کی حکومت ان کے اپنے ہاتھ میں ہو اور کسی صورت میں غیر ملکیوں کے ہاتھ میں نہ رہے۔

اور پھر کانگریس کے اس "دانا دشمن" نے واضح کیا۔

> سوراج حاصل کرنے کے لئے سب سے ضروری چیز ہندو مسلم اتحاد ہے۔۔۔۔ اگر ہم آزادی کے خواہاں ہیں تو آیئے سب متحد ہو جائیں۔ (تقاریر جناح)

کانگریس سے اختلاف اور علیحدگی کے باوجود قائدِ اعظم کا جہادِ آزادی میں یہی وہ بلند مقام تھا جس سے ان کا بڑے

سے بڑا انصاف پسند دشمن بھی انکار کی جرأت نہیں کر سکا۔ چنانچہ جب مرکزی کونسل کے انتخابات کے مرحلہ پر کانگریس ان کے مقابلہ پر آئی تو "بمبئی کرانیکل" جیسا نیشنلسٹ آرگن بھی اپنے سیاسی اختلافات بالائے طاق رکھ کر ان کی حمایت میں سرگرم کار ہو گیا۔ ووٹروں سے قائدِ اعظم کے حق میں اپیل کرتے ہوئے اس کی یہ شہادت ہمیشہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ رہے گی۔

> ان کی گذشتہ عظیم الشان خدمات، سچی حب الوطنی اور جذبۂ حریت ایسی صفات ہیں جو نہ تو کسی سفارش کی محتاج ہیں اور نہ کوئی شخص ان کی عظمت کو کم کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ علاوہ بریں جناح کے ناقابلِ تسخیر جذبۂ جہاد نے باقی شہریوں کے مقابلہ میں انہیں بہت امتیازی مقام عطا کر دیا ہے۔

اور پھر اس کا یہ انتباہ کیسا لازوال خراجِ تحسین ہے کہ:-

> اگر معمولی اختلافات کی بنا پر جناح جیسے قائد کو ملکی خدمات اور قومی جدوجہد کے اس منصب سے محروم کر دیا گیا تو یہ ایک ناقابلِ فراموش ذلت کا ارتکاب ہو گا۔
>
> (قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ)

سائمن کمیشن کا تقرر سیاسی اصلاحات کے پُرزور عوامی مطالبہ کے پیشِ نظر جس کی وضاحت میں قائدِ اعظمؒ نے ایک رائل کمیشن کے قیام پر زور دیا تھا۔ بالآخر حکومتِ برطانیہ حرکت میں آئی اور سیکرٹری آف اسٹیٹ لارڈ برکن ہیڈ نے ۱۹۲۷ء کے اواخر میں سر جان سائمن کی قیادت میں ایک کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا۔ ملک کی بدنصیبی اور آقایانِ فرنگ کی شانِ بے نیازی کا نتیجہ سمجھئے کہ اس کمیشن میں کسی ہندوستانی نمائندے کی شرکت کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ قومی نمائندگی کی یہ ناقابلِ برداشت توہین تھی جس کے خلاف پورا ملک سراپا صدائے احتجاج بن گیا اور اوائل ۱۹۲۸ء میں جب سائمن کمیشن یہاں پہنچا تو جگہ جگہ اس کے خلاف نہ صرف کالی جھنڈیوں اور ہڑتالوں کے پُرجوش مظاہرے کئے گئے بلکہ ہر قابلِ ذکر سیاسی جماعت نے اس کا پورا پورا مقاطعہ کیا۔ قائدِ اعظمؒ اس میدان میں پیش پیش تھے۔ مرکزی اسمبلی میں انھوں نے حکومت کی اس پالیسی پر بھرپور حملہ کیا، اور اراکینِ اسمبلی کی اکثریت کی تائید حاصل کر کے کمیشن کے ساتھ تعاون کی پیش کش مسترد کر دی۔ اور اس طرح پارلیمانی طریق سے کمیشن پر عدمِ اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے دنیا کے سامنے اس کی غیر نمائندہ حیثیت واضح کر دی۔ انھوں نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ سلطنتِ برطانیہ کے نمائندوں پر کمیشن کی ناکارہ برار حیثیت واضح کرنے کے لئے انھوں نے انگلستان کا بھی سفر اختیار کیا اور وہاں پہنچ کر سب پر یہ حقیقت واضح کی کہ پورا ملک سائمن کمیشن سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ چنانچہ اس نتیجہ خیز مساعی کا نتیجہ تھا کہ کمیشن کو بدترین ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور حکومتِ برطانیہ کے کارفرماؤں پر واضح ہو گیا کہ جب تک ہندوستان کو کماحقہٗ نمائندگی کے مواقع عطا نہیں کئے جائیں گے آئینی اصلاحات کے سلسلہ میں ہندوستان کا تعاون حاصل کرنا ممکن نہ ہو گا۔ سائمن کمیشن کی ناکامی کے بعد راؤنڈ ٹیبل کانفرنسوں کا آغاز حکومتِ برطانیہ کے اسی احساسِ شکست کا ردِ عمل تھا۔

ہندو مسلم اتحاد کی مساعیٔ جمیلہ کا نیا دور

لندن کی مذکورہ کانفرنسوں سے قبل قائدِ اعظمؒ نے از سرِ نو ایک نئے عزم سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک متحدہ نصب العینی پر لانے کی کوشش کی۔ ان کے مشہور "چودہ نکات" اسی سلسلۂ دراز کی ایک بنیادی کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے مئی ۱۹۲۸ء میں بمبئی کے مقام پر آل پارٹیز کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔ پھر اگست میں لکھنؤ میں ایک یونیٹی کانفرنس منعقد ہوئی اور ازاں بعد دسمبر میں آل پارٹیز کنونشن کے نام پر کلکتہ میں ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کا اہم اجتماع ہوا۔ قائدِ اعظمؒ نے ان کانفرنسوں کی کامیابی کے لئے خون پسینہ ایک کر دیا۔ لیکن مہاسبھائی لیڈروں کی منافرت انگیز روش اور متعصبانہ ذہنیت نے ہر موقع پر ملکی اتحاد کی کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ قائدِ اعظمؒ کے چودہ نکات مسترد کر دیئے گئے اور اس کے مقابلہ میں نہرو رپورٹ کو لایا گیا۔ جس میں نہ تو مسلمانوں کے مطالبات کو کوئی اہمیت دی گئی اور نہ اکثریت کی دستبرد سے ان کے حقوق کے تحفظ کی کوئی ضمانت موجود تھی۔ بجائے اس کے کہ مسلمانوں کو مطمئن کرنے کا کوئی سامان کیا جاتا۔ مہاسبھائی عناصر نے کانفرنسوں میں اپنی اکثریت کی مطلق العنانی کا وہ نقشہ پیش کیا جس سے مسلمان ہمیشہ کے لئے بدظن ہو گئے اور انہیں یقین ہو گیا کہ ہندو لیڈر نیشنلزم کا کتنا ہی دلفریب نقاب اوڑھ کر سامنے کیوں نہ آئیں ان کی مہاسبھائی ذہنیت کسی مرحلہ پر بھی رواداری اور عدل و انصاف کی لچک قبول نہیں کرے گی۔

آخری کوشش اور اس کا انجام

ان کانفرنسوں کی ناکامی نے اکثر مسلمان رہنماؤں کو بددل کر دیا۔ انہیں یقین ہو گیا کہ ہندو کبھی فراخدلی سے ان کی دوستی کو خوش آمدید نہیں کہہ سکیں گے۔ لیکن قائدِ اعظمؒ کا عزمِ صمیم اب بھی اپنی مساعی میں شکست قبول کرنے پر تیار نہیں تھا۔ گول میز کانفرنس ان کے لئے امید کی آخری کرن تھی۔ اور لندن میں انھوں نے جان توڑ جدوجہد کی کہ ہندوستان کے نمائندے بلند نگہی اور وسعتِ قلبی سے کام لیں اور حکومتِ برطانیہ کے سامنے پورے ملک کی طرف سے ایک متفقہ مطالبہ پیش کر دیا جائے۔ لیکن مہاسبھائی لیڈران کی اس امید کو پورا کرنے کے لئے بھی تیار نہ ہوئے اور اس کانفرنس کے دوران انہوں نے مفاہمت کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا۔

۱۹۰۵ء میں قائدِ اعظمؒ نے مسلم لیگ اور کانگریس کے باہمی سمجھوتے کے ذریعہ ہندو مسلم اتحاد کا جو بیڑا اٹھایا تھا اس کی مسلسل کوششوں میں اب پچیس برس پورے ہو رہے تھے۔ ان کی اخلاص بھری اپیلوں کو بار بار ٹھکرایا گیا۔ ان کی ہر مخلصانہ کوشش پر پانی پھیر دیا گیا۔ بڑے بڑے لیڈر عالمِ حیرت میں یہ کہتے سنائی دیئے کہ جناح ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں سے کبھی بیزار نہیں ہوتے۔ لیکن ایک دن صبر کا یہ پیمانہ لبریز ہو گیا اور گول میز کانفرنس میں جو کچھ ہوا اس سے ان کا دل ٹوٹ گیا۔ ان کے اپنے الفاظ میں۔

> گول میز کانفرنس کے اجلاس میں مجھے اپنی زندگی کا سب سے کاری دھچکا لگا۔ خطرہ نمودار ہوتے ہی ہندو دل و دماغ، ہندو جذبات، اور ہندو روش ایسی صورت اختیار کر گئے کہ بالآخر اتحاد کی توقع ہی اٹھ گئی۔

پچیس ۲۵ سال کے تلخ تجربوں کا یاس انگیز اور حوصلہ شکن انجام نگاہوں کے سامنے تھا۔ قائدِ اعظمؒ کی زندگی کا بہترین

(باقی بر صفحہ ۶۳)

"خرد کو غلامی سے آزاد کر!"

سعد حسن بشیر سلمہ اللہ تعالیٰ

(اس مقالہ کا نگارندہ "ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی" میں ایم۔ بی۔ بی۔ ایس۔ فرسٹ ایئر کا سٹوڈنٹ ہے ــــ عمر بمشکل اٹھارہ برس اور مقالہ نویسی میں پہلی کوشش۔ اس سلسلہ میں اس عزیز نے اپنے خط میں لکھا ہے۔

ماہ مئی کے شروع میں "پاکستان سٹوڈنٹ یوتھ کونسل" نے ایک مضمون نگاری کے مقابلہ کا اعلان کیا تھا۔ عنوان تھا ــــ خرد کو غلامی سے آزاد کر ــــ زیادہ سے زیادہ حد ۲۵۰۰ الفاظ تھے۔ ہدایت یہ تھی کہ مضمون میں اقبالؒ کے خیالات و افکار کی ترجمانی ہونی چاہیئے۔ یا کم از کم کوئی بات اس کے نظریات کے خلاف نہ ہو۔ ۲۰ مئی کو مضمون جمع کرا دیا تھا۔ اب ایک یا دو ہفتہ میں نتیجہ کا اعلان متوقع ہے۔

قرآنی فکر سے اپنی دلچسپی کے متعلق لکھا ہے۔

کوئی تین سال قبل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صاحب کے ذریعے پرویز صاحب کی قرآنی فکر سے متعارف ہوا تھا۔

انہی کی راہنمائی اور مدد سے آگے چل رہا ہوں۔

"تین سال قبل" کے معنی یہ ہیں کہ یہ عزیز نویں جماعت کا سٹوڈنٹ تھا جب یہ قرآنی فکر سے متعارف ہوا۔ سٹوڈنٹ بھی سائنس کا جس کے لئے عربی فارسی تو ایک طرف اُردو بھی قریب اجنبی زبان بن جاتی ہے۔ ان حالات میں اس نے قرآنی فکر کا مطالعہ شروع کیا، اور (جن صاحب نے اسے اس فکر سے متعارف کرایا تھا وہ کہتے ہیں کہ) اس تین سال کے عرصہ میں، اس ہونہار، سعادت مند برخوردار نے پرویز صاحب کی بیشتر کتابوں کو چاٹ ہی نہیں لیا، ہضم بھی کر لیا۔ اس کے باوجود، وہ ابھی مقالہ نویسی کے لئے تیار نہیں تھا۔ کیونکہ وہ کہتا تھا کہ ہنوز میری فکر خام، اور استعداد کم ہے۔ اسے اس کے لئے بمشکل آمادہ کیا گیا۔ نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ عزیز، حدِ الفاظ کی پابندی کی وجہ سے اشاروں ہی اشاروں میں کتنی اور کیسی کام کی باتیں کر گیا ہے۔

ہم اس مقالہ کو بلا کم و کاست شائع کر رہے ہیں ــــ محض اس لئے نہیں کہ اس سے اس نو آموز عزیز کی حوصلہ افزائی مقصود ہے۔ اس سے اصل مقصد، اس عزیز جیسے دیگر طالب علموں پر اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ فکر قرآنی کوئی ایسا ہَوّا نہیں جس سے ڈرا جائے ــــ نہ ہی اس میں کوئی ایسی بات ہے جس سے کفر کے فتوے لگ

جائیں۔ وہ بھی اگر اس طرح کوشش کریں تو یہ فکر بآسانی سمجھ میں آسکتی اور قلب و نگاہ میں جلا پیدا کر سکتی ہے۔
اس تعارف کے ساتھ ہم اپنے اس قابلِ قدر عزیز کی اس اوّلیں کاوش کو طلوعِ اسلام میں شائع کرتے ہوئے اسے مستحق مبارک باد قرار دیتے ہیں، اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالےٰ اس کے قرآنی ذوق میں مزید برکت عطا فرمائے۔ (طلوعِ اسلام)

انسانوں اور حیوانوں میں مابہ الامتیاز اشیاء میں عقل کو اہم ترین مقام حاصل ہے۔ انسانی ارتقاء عقل ہی کا مرہونِ منت نظر آتا ہے کہ کس طرح اس سے کام لے کر انسان آج ایسے مقام پر کھڑا ہے کہ اپنا ارتقاء خود متعین کرنے کی صلاحیت کا حامل دکھائی دیتا ہے۔ آج عقل کی کارفرمائیاں چاروں طرف نظر آتی ہیں، حتیٰ کہ اس کے بل بوتے پر انسان چاند پر کمندیں ڈال چکا ہے۔ لیکن اقبال جیسا دیدہ ور کہ جس کی عمر "خرد کی گتھیاں سلجھانے" میں گزری، اس کے باوجود عقل کو پابہ جولاں دیکھتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ خرد کیا ہے؟ اس کا مقام کیا ہے اور اس کی آزادی اور غلامی سے کیا مطلب ہے؟

عقل و خرد، انسانی ذہن کی صلاحیت ہے جسے ہم اس کے مظاہر ـــــ فکر، شعور، تدبر اور تعقل ـــــ کے ذریعے پہچانتے ہیں اور اس کا علم رکھتے ہیں۔ یہ حیوانات میں بھی کسی حد تک موجود ہوتی ہے، لیکن حیوانی عقل "شعورِ سادہ" (SIMPLE CONSCIOUSNESS) ہوتی ہے۔ لیکن عقلِ انسانی کی خصوصیت شعورِ ذات (SELF CONSCIOUSNESS) ہے اور شعورِ ذات ہی اسے جانوروں سے ممیز و ممتاز کرتا ہے۔ عقل، انسان کے لئے حصولِ علم کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

خرد کی رہنمائی کے سلسلے میں اس کے کئی مضمرات سامنے آتے ہیں۔ انسانی ضمیر، فکر اور جذبات کو عقل کی رہنمائی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ضمیر ایک مسلّمہ تھا۔ لیکن جدید نفسیات کی تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ انسان میں کوئی ایسی شے نہیں، جو خیر و شر اور نیک و بد میں از خود تمیز کر سکے۔ جسے ضمیر کہا جاتا تھا، وہ محض ایک شخص کے ماحول، تربیت اور پرورش کے اثرات ہیں جو اس کے لاشعور میں موجود رہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ دراصل "داخلی معاشرہ" (SOCIETY INTERNALIZED) ہوتا ہے۔ لہٰذا عقل کو اس کی رہنمائی میں استعمال کرنا، خرد کو گزرے ہوئے زمانے کے معاشرے کے خود ساختہ اصول و ضوابط کی غلامی میں دے دینا ہے۔ اس لئے اس افسانے کا ابطال خرد کی آزادی کے لئے ضروری ہے۔

فکر بھی دراصل علم کا نتیجہ ہوتی ہے، جو حسّی ادراک سے حاصل ہوتا ہے۔ فکر تو عقل ہی کا پرتو ہے۔ چنانچہ سب سے اہم چیز اب جذبات رہ جاتے ہیں۔ عقل و جذبات کے باہمی تعلق کے بارے میں صدیوں مفکرین پیچ و تاب میں مبتلا رہے۔ اور ابھی بھی کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ اس کے بارے میں ذرا آگے چل کر پھر نکات آئیں گے کہ خرد کی غلامی میں جذبات کا کیا عمل ہے۔

اب خرد کے مقام کا سوال ابھرتا ہے۔ عقل، انکشافِ حقیقت کی سعی کرتی ہے، لیکن اس کا ایک محدود دائرۂ کار ہے، جس سے وہ باہر نہیں نکل سکتی۔ مثلاً ڈاکٹر ایلکن کے الفاظ میں۔

کائنات کے آغاز اور انجام کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔
(THE GREAT DESIGN PP 35)

پھر سب سے بڑی بات یہ کہ عقل کی تحقیق کے سلسلے میں کسی بھی جگہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بات اس سلسلے میں حرفِ آخر ہے۔ بقول ڈاکٹر کرو مفر ——

دنیائے سائنس میں کسی موضوع پر حرفِ آخر آخری انسان کے لئے ہی چھوڑنا پڑتا ہے۔
(THE GREAT DESIGN PP 52)

عقل کی یہ محدودیت خارجی کائنات سے متعلق ہے۔ انسانی دنیا میں انداز مختلف ہوتا ہے۔ یہاں اس کا طریق تجرباتی ہوتا ہے۔ کسی مسئلہ کو لیتی ہے، اس کا حل تلاش کر کے عمل کرتی ہے۔ حل غلط نکلتا ہے پھر دوبارہ نیا حل تلاش کیا جاتا ہے اور وہی عمل دہرایا جاتا ہے۔ اور اسی عمل میں انسانی توانائیاں تو ضائع ہوتی ہی ہیں۔ انسانیت جن مصائب و آلام سے گزرتی ہے، تاریخ کے اوراق اس پر گواہ ہیں۔

لیکن اس سے یہ مقصد نہیں کہ عقل کو مردود قرار دے دیا جائے۔ عقل تو حصولِ علم کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور اس کے بغیر انسان حیوان ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے۔

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ (۸/۲۲)

خدا کے نزدیک بدترین خلائق وہ ہیں جو گونگے بہرے بنے رہتے ہیں اور عقل سے کام نہیں لیتے۔

اقبالؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ کیونکہ بقول اس کے۔ ؎

گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام

اور اسی لئے۔ ؎

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ

اس کا یہ کہنا ہی کہ "خرد کو غلامی سے آزاد کر" خرد کی اہمیت کی دلیل ہے کہ انسانی ترقی کے لئے خرد ضروری ہے لیکن خرد آزاد۔

چنانچہ اب خرد کی آزادی اور غلامی کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔

عقل کلیتاً آزاد تو ہو ہی نہیں سکتی کہ بالآخر یہ زمان و مکان میں مقیّد ہے۔ چنانچہ ایسے اصولوں کی تلاش میں جو زمان و مکان سے ماوراء ہوں، جو انسانی مسائل کا عالمگیر اور غیر متبدل حل دیں، اس نے کئی طریقے اختیار کئے اور اس طویل تجرباتی طریق میں جگہ جگہ، مقام بمقام، بھٹک گئی اور اسیر و غلام ہو کر رہ گئی۔ اس کی کیفیت تو یہ ہے ؎

فکرِ انساں بُت پرستے، بُت گرے ہر زماں در جستجوئے پیکرے!
باز طرحِ آزری انداخت است تازہ تر پروردگارے ساخت است

انسان کے "دماغ کے بُت خانہ" میں طرح طرح کے بت اور آتا ڈھلتے رہے، اور یہ اور اس کی عقل ان کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے ؎

رہ مدہ در کعبہ اے پیرِ حرم اقبال را | ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

یہ بت انسان کی خواہشات کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ جذبات ہی کی وہ خوفناک گھاٹی ہے جہاں سے پھسل کر انسان سیدھا ہلاکت و بربادی کے خوفناک جہنم میں گر جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے۔

اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ... (۴۵/۲۳)

کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہشات ہی کو اپنا معبود بنا لیا؟ یہ ہے وہ جسے خدا نے علم کے باوجود گمراہ کر دیا ہے۔

یعنی عقل موجود تھی، لیکن جذبات غالب آ گئے۔ اور وہ راستے میں بھٹک گئی اور جذبات کی غلام ہو گئی۔ عقل پر غالب بے لگام جذبات تو ایک طوفان بلاخیز ہیں ؎

اس سیل سبک سیر و زمیں گیر کے آگے | عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

چنانچہ جب عقل جذبات سے مغلوب ہو جائے تو وہ غلام ہو جاتی ہے اور اس کا فریضہ یہ ٹھہرتا ہے کہ وہ جذبات کی تسکین کے سامان فراہم کرے اور ان کو حق بجانب قرار دینے کے لئے دلائل تراشے۔ چنانچہ بقول (H.C. WARREN)

عقل اس ذہنی عمل کا نام ہے جو اس کام یا ادائے کے جواز کے لئے خوش آئند دلائل تراشے جو در اصل کسی اور ہی جذبے کے ماتحت پیدا ہوا ہو۔ خواہ اس شخص کو جس کی عقل یہ کر رہی ہو اس کا احساس تک نہ ہو۔ (DICTIONARY OF PSYCHOLOGY)

چنانچہ عقل جذبات کی لونڈی بن جاتی ہے۔ لیکن اس کا علاج یہ نہیں کہ جذبات کو فنا کر دیا جائے۔ خرد کو جذبات کی غلامی سے نکالنے کا طریق یہ ہے کہ تسلیم کیا جائے کہ جذبات بہت بڑی قوت ہیں، لیکن عقل کے فیصلے ان سے بالاتر رکھے جائیں۔ اور پھر ان کو بروئے کار لانے کے لئے جذبات کی قوت استعمال کی جائے۔ یعنی جذبات کو کسی بلند مقصد کے حصول کے لئے عقل کی روشنی میں کام میں لایا جائے۔ بقول اقبالؒ ؎

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے | ہے یہ نہایت اندیشہ و کمال جنوں

یعنی مومن کی شان یہ ہے کہ ؏

فرزانہ بگفتارم، دیوانہ بہ کردارم

طلسم افلاطونی نے جذبات کو فنا کرنے میں نجات کا تصور کیا اور اس کے ساتھ حقائق سے انکار کیا۔ یہاں سے ایک نئی غلامی کی ابتدا ہوتی ہے۔

انسانی شعور نے جب پہلے آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو نہایت نامساعد حالات میں پایا۔ فطرت کی مہیب قوتوں کو سامنے پایا تو ایک بزدل انسان نے یہ سوچا کہ خارجی کائنات کے وجود سے ہی انکار کر دیا جائے اور "گوشہ نشین ہو کر اندرونی دنیا" میں ڈوب جائے۔ افلاطون نے حقیقی دنیا، دنیائے تصورات کو قرار دیا۔ چنانچہ عقلِ انسانی ٹھوس حقائق سے انکار کر کے طلسم افلاطون کی اسیر ہو گئی۔ دنیا قابل نفرت ٹھہری، اس سے بھاگنے میں عافیت سمجھی گئی۔ تصوف، ہندو ویدانیت، خانقاہیت، رہبانیت۔ خرد کی اسی غلامی کے آئینہ دار ہیں ؎

راہب دیرینہ افلاطون حکیم | از گروہِ گوسفندانِ قدیم

بر تخیلہائے ما فرماں رواست　　جام او خواب آورد گیتی رباست
گوسفندے در لباس آدم است　　حکم او بر جان صوفی محکم است

قرآن نے خرد و علم کو اس غلامی سے نجات دلائی۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (۳۹/۵)

کائنات فی الحقیقت موجود ہے اور بالمقصد پیدا کی گئی ہے۔

اسے انسان کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے۔ (سخر لکم ما فی السمٰوٰت والارض) بقول اقبالؒ

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں　　یہ گنبد افلاک یہ خاموش فضائیں

اور اس آزادی کو حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ؎

جہاں را جز بہ چشم خود ندیدم

یہی وہ نگاہ ہے جس کے بدلنے سے اشیاء کی قیمتیں بدل جاتی ہیں۔ اقدار بدل جاتی ہیں اور ارض و سما بدل جاتے ہیں۔ ؎

قیمتِ ہر شے ز انداز نگاہ

لیکن ذہن کی اس "چشم خود" پر تقلید پردہ ڈال دیتی ہے۔ تقلید عقل انسانی کو غلامی کی ایسی غیر مرئی زنجیروں میں جکڑ دیتی ہے جن کی آہنی گرفت خرد کی ہر تازگی کو مرجھا دیتی ہے۔ جس روش پر اسلاف کو پایا سے گوش بند چشم بند و لب بستہ ——— اسی پر چلتے جائیں گے۔ لیکن کائنات تو ارتقاء پذیر ہے۔ جو آگے نہ بڑھے ختم ہو جاتا ہے آفاقی دنیا کا یہ قانون انسانی دنیا میں بھی جاری ہے۔ انسانیت کا ارتقاء علم و عقل کی نئی نئی راہوں پر سفر کے ذریعے ہوتا ہے۔ تقلید عقل کو غلام بنا کر ندرت کو ختم کر دیتی ہے۔ اور اس غلام کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

کیش او تقلید و کارش آزری ست　　ندرت اندر مذہب او کافری ست
تازگیہا وہم و شک افزایدش　　کہنہ و فرسودہ خوش می آیدش

اس کے برعکس مرد حر وہ جو حریت فکر و نظر کا علمبردار ہوتا ہے اور ہر وقت تخلیق کرتا ہے کہ "تخلیق" کے لئے جدت و ندرت بنیادی شرائط ہیں ؎

ما ز تخلیق مقاصد زندہ ایم　　از شعاع آرزو تابندہ ایم

آرزو بھی حریت حیات کے لئے لازمی ہے۔ جو شخص کشمکش حیات سے فرار اختیار کر کے مردہ ہو جاتا ہے ——— وہ زندہ کہلانے کے قابل نہیں رہتا، جامد پتھر ہو جاتا ہے ؎

ہر کہ تخم آرزو در دل نہ کشت　　پائمال دیگراں چوں سنگ و خشت

اور جمود غلامی ہے، اس لئے ؎

نہ ہو نومید، نومیدی زوال علم و عرفاں ہے　　امید مرد مومن ہے خدا کے رازدانوں میں

تقلید، تقلید آباء ہی نہیں، تقلید اغیار بھی ہے۔ اپنی عقل کی تخلیقی صلاحیتوں سے کام نہ لینا اور اسے دوسروں کے افکار کے تابع کر دینا، خودی کی بدترین غلامی ہے۔ عقل میں نئی بات سوچنے کی صلاحیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ ایسا

شخص غلام ہے ؎

ابن غلام ابن غلام ابن غلام حریت، اندیشہ و اولوالعزم

اسی لئے اقبالؒ کی پکار ہے ؎

اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی

پس خود کو اس غلامی سے آزاد کرنے کے لئے ؎

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش براہِ دیگراں رفتن حرام است

تقلید ہی کا سہارا لے کر مذہبی پیشوائیت نے خود کو عنکبوتی جالوں میں پھانس لیا۔ عقلِ انسانی پر خوف کے پہرے بٹھا کر اسے غلام بنا لیا۔ کہیں مردوں کی پرستش کروائی اور کہیں ملوکیت کی۔ اور بقول اقبالؒ انسان کو۔ "کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری" بنا دیا۔ پس عقل کو اور انسان کو آزادی سے ہمکنار کرنے کے لئے ان کو اکھاڑ پھینکنا ضروری ہے۔ ان کی حقیقت تو یہ ہے ؎

ایں خدا تا سجدہ اش کردی خدا است چوں یکے اندر قیام آئی فنا است

کرامات (جو جبر ہی کی شکل ہیں) اور توہم پرستی کے جعلی آقاؤں کے سامنے عقل و خرد کو ماؤف کر کے غلام بنا لیا گیا۔ چنانچہ اقبالؒ نے نوجوانوں کو پیغام دیا۔

ایسے ہی لوگوں نے تاریخِ اسلام سے آپ کی ناواقفیت کی بنا پر فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ کو غلام بنا رکھا ہے..... وہ آپ کو سکھاتے ہیں کہ حسّی ادراک حجابِ اکبر ہے..... نوجوانو! اس شعبدہ بازی سے ہوشیار رہو۔ ("NEW ERA" لکھنؤ میں علامہ اقبال کا مقالہ۔ ۲۸ جولائی ۱۹۱۷ء)

اِس طرح انسان عقل کو جگہ جگہ غلامی میں دیتا گیا ــــ ایک زنجیر سے پاؤں نکالا اور دوسری میں ڈال دیا۔ نتیجہ اس داستانِ خونچکاں کا یہ کہ ؎

از غلامی فطرتِ او دوں شدہ نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ

یہاں ہمیں عقل کی غلامی اور خرد کی اسیری کا سراغ ملتا ہے۔

عقلِ انسانی "عقلِ حیلہ جو" ہے۔ اس لئے کہ عقل کا مقصد ذاتی مفاد کا حصول ہے۔ اور یہی فساد کی جڑ، بذاتِ خود مفاد کا حصول شر نہیں۔ عقل اس مفاد کے حصول کے لئے جو طریقے اختیار کرتی ہے وہ اسے غلام بنا دیتے ہیں۔

نفسیاتی طور پر ذاتی مفاد کے حصول کا جذبہ دو قوتوں کے تابع ہوتا ہے، جذبۂ تحفظِ خویش اور جذبۂ تفوقِ خویش۔ اور انہی کی تسکین کے لئے عقل کوشاں ہوتی ہے۔

اسی عقل کو اقبالؒ "عقلِ خود بیں" کہہ کر پکارتا ہے۔ ؎

عقلِ خود بیں دگر و عقلِ جہاں بیں دگر است

دونوں میں فرق یہ ہے عقلِ خود بیں محض ذاتی مفاد کے حصول کے لئے کوشاں ہوتی ہے۔ ؎

سود خود بیند نہ بیند سودِ غیر

اور اس کے برعکس "عقل جہاں بیں" عالم گیر مفاد کے لئے کام کرتی اور "سود ہمہ" کی فکر کرتی ہے۔

پس اس سے واضح ہے کہ عقل کی غلامی کے اسباب و علل، غلامیٔ خرد اور غلامیٔ انسان کا نتیجہ ہے عقل خود بیں کا۔ فساد بحر و بر اور انسانی تاریخ کی خونچکاں داستان میں بھی کارفرما ہے۔

صرف انفرادی نہیں، اجتماعی سطح پر بھی یہ تباہیاں جلو میں لائی۔ یہاں اس نے قومیت و وطن پرستی کو جنم دیا۔ سائنس اور علوم و فنون اس کے تابع ہو گئے اور عقل کا فریضہ یہ ٹھہرا کہ اپنے گروہ یا قوم (یا فرد) کے تغلب کا سامان کرے۔ اس طرح اگر فکر کو آزاد کر دیا جائے تو وہ ذاتی مفاد کے حصول کے لئے، دوسروں کے نقصان کی پروا کئے بغیر، سب کچھ کر گزرے گی ؎

گو فکر خداداد سے روشن ہے زمانہ   آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

اس طرح عقل انسانی جبلت کے تابع ہو گئی اور اس کی آزادی دراصل غلامی ہے۔

چنانچہ صدیوں کے تجربات کے بعد مفکرین عالم اس نتیجے پر پہنچ رہے ہیں کہ عقل خود بیں ہی دراصل فساد کی جڑ ہے اور اپنی محدودیت اور غلامی کی وجہ سے وہ ایسے حقائق دریافت کرنے سے قاصر ہے جو اسے آزادی سے ہمکنار کر کے جہاں بیں بنا دے۔ اس کے لئے ایک زمان و مکان سے ماوراء، غیر متبدل، عالم گیر ضابطۂ حیات چاہیئے۔

لیکن یہ کہاں ہے اور کیسے ملے گا — جواب ندارد۔ چنانچہ اب یہ حالت ہے کہ ؎

عشق ناپید، و خرد می گزدش صورت مار   عقل کو تابع فرمانِ نظر نہ کر سکا

اس کا نتیجہ یہ ؎

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا   زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا   اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا!

عقل نے ادراکِ حقیقت کا دعویٰ کیا، لیکن اکثر و بیشتر داخلی ہی رہی۔ معروضی یا خارجی حقائق کو کلیتاً نہ پا سکی۔ اور نہ پا سکے گی[1]۔ اس لئے کہ عقل راہنما نہیں ایک قوت ہے اور قوت، بے محابا قوت تباہ کن ہوتی ہے۔ اس لئے اس پر پابندیاں ضروری ہیں[2]۔

ان پابندیوں سے اختیار و ارادہ پر حرف نہیں آتا۔ خود خدا نے کہا ہے۔

وَعْدَ اللّٰهِ ۖ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ۔ (۳۰/۶)

یہ خدا کا وعدہ ہے کہ وہ کبھی اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرے گا۔

اس سے کتنی بڑی پابندی خدا نے اپنے اوپر عائد کر لی ہے۔ لیکن اس سے اس کے اختیاراتِ مطلق میں کمی نہیں ہوئی لہٰذا حدود میں عقل کو پابند کرنے سے اس کا اختیار سلب نہ ہو گا۔ بلکہ اس کی وسعتوں میں اضافہ ہو گا۔ از خود عائد کردہ پابندیوں سے وسعتوں میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (۲/۲۸۶) خدا یہ پابندیاں اس لئے لگاتا ہے کہ انسانی ذات

---

[1] و [2] یہاں انگریزی کی بعض اہم کتابوں کے حوالے درج ہیں۔

(نفس) میں وسعت پیدا ہو ۔۔۔ نہر کے پانی کی ٹھوکر (FALL) بہاؤ کو روکتی نہیں، تیز تر اور جوشیلا کردیتی ہے معمولی مثال ہے کہ ایک شخص اپنے اوپر ورزش کرنے کی پابندی عائد کرتا ہے۔ روزانہ اس پابندی پر عمل کرنے سے اس کی جسمانی صلاحیتوں میں کتنی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔

چنانچہ تاریخ کی صدگاہیں گواہ ہیں کہ جب بھی انسان نے آگے بڑھ کر حدود سے تجاوز کیا، عقل کو جبلی تقاضوں کا غلام بنا دیا، اس کا نتیجہ "یفسد فی الارض و یفسك الدماء" کے سوا کچھ نہ ہوا۔ جب عقل کو حدود کے اندر رکھ کر آزاد کیا گیا تو زندگی مسکرا اٹھی۔ گیسوئے تابدار، تابدار تر ہو گیا۔

سوال یہ ہے کہ یہ حدود کون مقرر کرے گا؟ جن کے اندر رہتے ہوئے انسان مکمل طور پر آزاد رہے۔ ہر شخص آزاد، فکر و نظر آزاد اور خودی ارتقا پذیر رہے۔ جواب اس کا۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے ۔۔۔ حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آذری (اقبالؔ)

اور اس کا عملی طریق قرآن کی "مستقل اقدار" کی پیروی ہے۔

سورۂ آل عمران میں ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ ...... وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۹)

کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ۔۔۔ خواہ خدا اسے کتاب، ضابطۂ قوانین، حکومت اور نبوت بھی دے دے ۔۔۔ کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم خدا کی جگہ میری پیروی کرو۔ اسے کہنا چاہیئے کہ تم اس کتاب کی پیروی کرو جس کی تم تدریس کرتے ہو اور اس طرح "ربّانی" بن جاؤ۔

اس طرح ایک خدا کی محکومیت میں انسان آزاد ہو جائے گا ؎

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ۔۔۔ ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اور اس آزادی سے مطلوب ہے "ربّانی" بننا یعنی صفاتِ خداوندی کا مظہر (علیٰ حدِ بشریت) کہ جس میں انسان کی شخصیت و ذات کے تمام پہلو نشو و نما پائیں، اس طرح کہ کوئی پہلو نظر انداز نہ ہو۔ اس طرح ایک حسن و جمال اور تناسب و توازن کی پیکر خودی اُبھرے گی جو آزادیٔ خرد کا منشاء مقصود ہے۔ اقبالؔ نے یہی کہا ؎

گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام ! ۔۔۔ شرحِ رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام

لیکن یہ پابندیاں، یہ حدود اللہ بار بار نہیں آئیں گی۔ آخری دفعہ یہ متعین کی جا چکیں ہیں اور اب قرآن کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ ختمِ نبوت سے یہی مراد ہے۔ انسانی شعور کی ابتداء میں رسول آتے ہیں، اور ہر موڑ پر انسانیت کی رہنمائی کرتے۔ حتیٰ کہ مشیت ایزدی سے شعورِ انسانی سنِ رُشد کو پہنچ گیا۔ تب آخری رسول مبعوث ہوا، تاکہ راہبر و جادۂ حیات کے لئے، تا قیامت، زندگی کی شاہراہوں پر ایسے نشانات راہ نصب کردے کہ وہ وحی کی روشنی میں عقل سے کام لے کر منازلِ زندگی طے کرتا چلا جائے۔ اس طرح انسان کو، اس کی عقل و فکر کو آزادی کی وہ ابدی ہدایت ملی جس کے لئے وہ تڑپ رہا تھا۔ بقول اقبالؔ ۔۔۔

"اس طرح ختمِ نبوت کے معنی یہ ہیں کہ اب نوعِ انسانی کی تاریخ میں کوئی شخص اس امر کا مدعی نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی مافوق الفطرت اختیار کی بنا پر دوسروں کو اطاعت کے لئے مجبور کر سکتا ہے۔ ختمِ نبوت ایسی نفسیاتی قوت ہے جو اس قسم کے ہر اقتدار کا خاتمہ کر دیتی ہے۔"

(خطباتِ تشکیلِ جدید (انگریزی) صفحہ ۱۲۰)

چنانچہ اب فکرِ انسانی کسی کی غلام نہیں رہ سکتی۔ وہ حسیّ ادراک سے علم حاصل کرے گی اور وحی کی روشنی میں اس طرح آگے بڑھتی جائے گی کہ اس کی ذات (خودی) کی نشوونما ہوتی جائے۔ بقول اقبال ـــــ

اسلام کا ظہور، استقرائی علم کا ظہور ہے۔ اسلام میں نبوت اپنی تکمیل کو پہنچ گئی ...... زندگی عالمِ طفولیت میں نہیں رہ سکتی ...... موروثی بادشاہت اور مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ کر دیا گیا ـــ قرآن غور و فکر اور تجارب و مشاہدات پر بار بار زور دیتا ہے۔ وہ تاریخ اور فطرت کو علمِ انسانی کے ذرائع بتاتا ہے۔ یہ سب اسی مقصد کے گوشے ہیں جو ختمِ نبوت کی تہہ میں پوشیدہ ہے۔

(خطباتِ تشکیلِ جدید (انگریزی))

چنانچہ ختمِ نبوت نوعِ انسانی کے لئے ہر غلامی سے آزادی کا پیام ہے۔ منشور آزادی ہے۔ لہٰذا آزادی سے ـــ فکر کی، خرد کی، انسان کی ـــ مقصود یہ ہے کہ انسان کی خودی کی نشوونما ہو۔ اس کے لئے حدود اللہ کی پابندی اور مستقل اقدار پر یقین ضروری ہے۔ اور یہ ایمان وہی لا سکتا ہے جس کا ذہن تقلید و تشکیک اور غیر خدائی قوتوں کی غلامی سے آزاد ہو۔ ع

سمجھے گا نہ تو جب تک بے رنگ نہ ہو ادراک

خرد کو غلامی سے آزاد کرنے سے زندگی ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائے گی۔ کیونکہ خودی (نفس یا ذات) کی نشوونما ہو رہی ہو گی (تزکیہ) یہی قرآن کا منشا ہے اور یہی حقیقی آزادی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ۝ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

O ye who believe! Fear God as He should be feared, and die not except in a state of Islam. And hold fast, all together, by the Rope which God stretches out for you, and be not divided among yourselves.

PREMIER TOBACCO INDUSTRIES LIMITED

ادارۂ طلوعِ اسلام کی مطبوعات کی قیمتیں!

نوٹ:- ان قیمتوں میں پیکنگ اور ڈاک کا خرچ شامل نہیں۔

نام کتاب	قیمت
مفہوم القرآن (پارہ اوّل)	-/۴ روپے
" " (پارہ ۲ تا پارہ ۲۷)	۲/۵۰ روپے فی پارہ
" " (پارہ ۲۸، ۲۹ یکجا)	-/۷ " "
" " (پارہ ۳۰)	-/۵ " "
مفہوم القرآن (جلد اوّل)	-/۳۵ روپے
" " (جلد دوم)	-/۳۵ "
" " (جلد سوم)	-/۴۰ "
" " (مکمل سیٹ)	-/۱۱۰ "
لغات القرآن (جلد اول)	-/۲۰ روپے
" " (" دوم)	-/۲۰ "
" " (" سوم)	-/۲۰ "
" " (" چہارم)	-/۲۰ "
" " (مکمل سیٹ)	-/۸۰ "
اسلام کیا ہے؟ (اعلیٰ)	-/۱۵ روپے
" " " (سستا ایڈیشن)	-/۸ "
انسان نے کیا سوچا؟	-/۲۰ "
من و یزداں	-/۲۵ "
جوئے نور	-/۲۵ "
ابلیس و آدم	-/۲۵ "
شعلۂ مستور	-/۲۵ "
اقبال اور قرآن	-/۲۵ "

نام کتاب	قیمت
برقِ طور	-/۲۵ روپے
جہانِ فردا (نقش ثانی)	-/۲۵ "
کتاب التقدیر (نقش ثانی)	-/۳۰ "
شاہکارِ رسالتؐ	-/۴۵ "
قائدِ اعظمؒ کے تصور کا پاکستان	-/۱۵ "
معراجِ انسانیت	-/۳۰ "
سلیل	-/۱۰ "
فردوسِ گم گشتہ	-/۱۰ "
اسلامی معاشرت	-/۴ "
اسباب زوالِ اُمت	-/۲ "
جہاد	۲/۵۰ "
قرآنی قوانین و اقتدار	-/۴ "
قرآنی فیصلے جلد اوّل	-/۵ روپے
قرآنی فیصلے جلد دوم	-/۵ "
قرآنی فیصلے جلد سوم	-/۵ "
قرآنی فیصلے مکمل سیٹ	-/۱۵ "
طاہرہ کے نام	-/۶ روپے

نام کتاب	قیمت
سلیم کے نام (جلد اول) مجلد	۱۲/- روپے
〃 〃 〃 (جلد دوم) 〃	〃 ۱۲/-
〃 〃 〃 (جلد سوم) 〃	〃 ۱۲/-
〃 〃 (مکمل سیٹ) 〃	〃 ۳۶/-
عربی خود سیکھئے (چوتھا ایڈیشن)	〃 ۷/-
پاکستان کا معمارِ اوّل	〃 ۳/۵۰
فجر الاسلام (اُردو ترجمہ) (علامہ احمد امین مصری) (جلد اوّل)	۵/- روپے
فجر الاسلام (اُردو ترجمہ) (علامہ احمد امین مصری) (جلد دوم)	〃 ۵/-
اسلام پہ کیا گذری؟ (از علامہ احمد امین مصری)	〃 ۸/-
منزل بہ منزل	〃 ۸/-
ASLAM A CHALLENGE TO RELIGION. (مجلد)	〃 ۳۵/-
(پیپر بیک)	〃 ۲۰/-
قتلِ مرتد	〃 ۲/-

نام کتاب	قیمت
عالم گیر افسانے	۱/- روپیہ
ختم نبوت در تحریک "احمدیت" (نقش ثانی)	۱۵/- روپے
پرنسپلز آف لا میکنگ ان اسلام (انگریزی)	〃 ۳/-
جمع القرآن (علامہ تمنا عمادی مرحوم)	〃 ۳/-
تاریخ الامت (جلد اوّل)	〃 ۳/-
〃 〃 (جلد دوم)	〃 ۳/-
〃 〃 (جلد سوم)	〃 ۳/-
〃 〃 (جلد چہارم)	〃 ۳/-
〃 〃 (جلد پنجم)	〃 ۴/-
〃 〃 (جلد ششم)	〃 ۴/-
〃 〃 (جلد ہفتم)	〃 ۳/-
〃 〃 (جلد ہشتم)	〃 ۳/-
از علامہ اسلم جیراجپوری مرحوم (مکمل سیٹ)	〃 ۲۵/-
QURAN AND PHENOMENA OF NATURE از ڈاکٹر سید عبدالودود	〃 ۲۴/-

ملنے کے پتے ـــــــ

(۱) ـــــــ ادارہ طلوعِ اسلام ـ ۲۵ ـ بی گلبرگ ۲ ـ لاہور

(۲) ـــــــ مکتبۂ دین و دانش ـ چوک اردو بازار ـ لاہور

نقد و نظر

تصوّف کی فسوں سازیاں

جب ہم تصوف کے سلسلے میں ایسے عقائد پیش کرتے ہیں جو قرآن کریم کے خلاف، علم اور عقل کی نقیض، اور جہالت پر مبنی خرافات ہوں تو تصوف کے حامیوں کی طرف سے یہ کہہ کر بات ٹال دی جاتی، یا اپنے آپ کو مسلسل خود فریبی میں مبتلا رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ سب کچھ ان بھنگڑ خانوں کے فقیروں کی شطحیات ہیں جنھیں تصوف کی حقیقت کا کچھ علم نہیں ہوتا۔ جو بزرگ تصوف کے ساتھ علوم و معارف کے بھی ماہر ہوتے ہیں وہ اس قسم کی باتیں نہیں کرتے۔ اتفاق سے اس وقت ہمارے سامنے ایک ایسی کتاب آگئی ہے جس کے مصنف ایک ایسی شخصیت ہیں جن کا مذہبی علوم کی دنیا میں بڑا ممتاز ترین مقام ہے۔ یہ شخصیت ہیں شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ۔ جو عام طور پر محدث دہلوی کے امتیازی لقب سے متعارف ہیں، اور جن کے حضور، منبر اور خانقاہ ـــــ دونوں کا سر احترام سے جھک جاتا ہے۔ کیونکہ انہیں علوم شریعت ہی کا ماہر نہیں سمجھا جاتا بلکہ طریقت و معرفت میں بھی ان کا مقام بہت بلند تصور کیا جاتا ہے۔ ان کی ایک تصنیف ہے ـــــ انفاس العارفین ـــــ جس کا ترجمہ سید محمد فاروق القادری، ایم۔ اے، نے کیا ہے اور جسے دائرۃ المعارف، گنج بخش روڈ، لاہور نے پہلی بار شائع کیا ہے۔ کتاب عمدہ سفید کاغذ پر مجلد شائع ہوئی ہے اور قیمت فی جلد بیس روپے ہے۔ کتاب کے جیکٹ پر اس کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے۔

> یہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے آخری دور کی تصنیف ہے۔ اس لئے اپنی جامعیت اور شگفتگیٔ بیان کے اعتبار سے شاہ صاحبؒ کی دوسری کتابوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ اگر شاہ صاحبؒ کی شخصیت کو دین فہمی میں ایک معیار مان لیا جائے تو بلاشبہ آپ کی یہ کتاب برصغیر میں گذشتہ سو برس سے پیدا ہونے والے تمام اختلافات مٹا سکتی ہے۔

خود مترجم نے اپنے مقدمہ میں اس کتاب کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے۔

> بظاہر تو اس کتاب کی حیثیت ایک تذکرے کی ہے، لیکن درحقیقت یہ کتاب علم شریعت و معرفت کا خزینہ اور حکمت و دانائی کا ایسا گنجینہ ہے کہ جس میں تاریخ، فقہ، تصوف، کلام اور عقائد کے سینکڑوں مسائل باتوں ہی باتوں میں حل کر دیئے گئے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کتاب کو بجا طور پر خاندان ولی اللہی کے فکر تصوف کا صحیح ترجمان کہا جا سکتا ہے اور یہ کتاب بقول مولانا عبید اللہ سندھی، شاہ ولی اللہ کے فلسفہ اور تصوف کی روح ہے۔ (صفحہ ۶)

اور خود شاہ صاحبؒ کا تعارف ان الفاظ میں :-

چونکہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تعلیم و تربیت اور روحانی سلسلہ کی تکمیل اپنے والد گرامی شاہ عبدالرحیم سے ہوئی ہے اس لئے شاہ صاحبؒ بنیادی طور پر وحدت الوجودی ہیں ..... شاہ صاحبؒ کے سوانح نگار اور محققین اس بات پر پہنچے ہیں کہ شاہ صاحب کے نزدیک وجود و شہود کا جھگڑا لفظی نزاع ہے۔ اصل وحدت الوجود ہی ہے جس کے شاہ صاحبؒ تمام اکابر صوفیاء کی طرح قائل ہیں۔ (صفحہ ۱۰)

وحدت الوجود کا فلسفہ، جو تصوف کی بنیاد ہے، بڑا دقیق اور تشریح طلب ہے جس کی وضاحت کا نہ یہ مقام ہے، نہ سر دست ہمیں اس کی فرصت۔ مختصر، عام فہم الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اس فلسفہ کی رو سے عقیدہ یہ ہے کہ کائنات میں جو کچھ نظر آتا ہے اس کا اپنا کوئی وجود نہیں۔ یہ سب خدا ہی خدا ہے۔ میں بھی خدا ہوں، تم بھی خدا ہو۔

اس فلسفہ کا بانی محی الدین ابن عربیؒ کو قرار دیا جاتا ہے جو شیخ اکبر کے لقب سے متعارف ہیں۔ اپنے اس فلسفہ اور عقیدہ کی رو سے وہ اپنی کتاب "فصوص الحکم" میں یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ :-

پس فرعون کو ایک طرح سے حق تھا کہ کہے انا ربکم الاعلیٰ۔ کیونکہ فرعون ذاتِ حق سے جدا نہ تھا۔ اگرچہ اس کی صورت فرعون کی تھی۔

ان کی یہ وہ کتاب ہے جس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے لکھا تھا کہ :-

"جہاں تک مجھے علم ہے فصوص الحکم میں سوائے الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں"

(اقبال نامہ۔ جلد ۱۔ صفحہ ۴۴)

جسے علامہ اقبالؒ نے الحاد و زندقہ قرار دیا ہے وہ یہی عقیدۂ وحدت الوجود ہے۔ ہندوستان میں امام سرہندی علیہ الرحمتہ نے اس عقیدہ کی سخت مخالفت کی اور اس کے برعکس دوسرا عقیدہ پیش کیا، جسے وحدتِ شہود کہا جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے کوشش کی کہ ان دونوں نظریوں میں تطبیق دے دی جائے۔ وہ اس میں کس حد تک کامیاب ہوئے، اسے چھوڑیئے۔

زیر تبصرہ کتاب کے مترجم نے کہا ہے کہ شاہ صاحب بنیادی طور پر وحدت الوجودی ہیں اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنی اس کتاب میں کیا کچھ لکھا تھا۔ یہ کتاب ان کے خاندانی بزرگوں کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔ اس میں وہ اپنے "عم" بزرگوار، بلند قدر، اہل ذوق و وجود کے پیشوا، صاحبانِ معرفت و شہود کے امام، سلسلۂ اہلِ عرفان کے لئے رابطہ اور اہلِ کمال کی آنکھ کا تارا، خدائے بے نیاز کے ساتھ لو لگانے والے سیدنا، مولانا، شیخ ابوالرضا محمدؒ کے متعلق لکھتے ہیں کہ انہوں نے :-

فرمایا۔ ایک مرتبہ میں اپنے اسماء و صفات کی طرف متوجہ ہوا تو ننانوے ناموں سے بھی زیادہ پائے۔ کچھ اور توجہ کی تو چار ہزار سے زیادہ پائے۔ پھر اور تجسس کیا تو اپنے اسماء و صفات کی کوئی حد شمار نہ پائی۔ جب اس مقام پر پہنچا تو اس حالت میں اپنی ذات کو دیکھا کہ میں کائنات کو پیدا بھی کر رہا ہوں اور مار بھی رہا ہوں۔ ارباب ولایت کبریٰ پر ایسی حالتیں اکثر

گذرتی رہتی ہیں۔ (صفحہ ۲۱۰)

آپ نے دیکھا کہ یہاں یہ بزرگ دعویٰ کر رہے ہیں کہ وہ کائنات کو پیدا بھی کر رہے ہیں اور مار بھی رہے ہیں۔

یہ شاہ صاحبؒ کے عم بزرگوار تھے۔ اس کے بعد آپ اُن کے والد بزرگوار، شاہ عبدالرحیمؒ کے متعلق سنیئے۔ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:-

والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ میں نے چشمِ حقیقت سے دیکھا کہ ایک جماعت حضرت حق تعالےٰ کو واقعہ میں دیکھنے کا ارادہ کر کے رواں دواں جا رہی ہے اور میں بھی اس جماعت میں شامل ہوں۔ ایک صاف قطعہ زمین سامنے آیا ـــ اور ادھر وقت عصر ہو گیا۔ ان لوگوں نے مجھے اپنا امام بنا لیا۔ جب نماز ختم ہوئی تو میں نے جماعت کی طرف رخ کر کے کہا کہ دوستو! اس قدر سعی و کاوش کس کی تلاش میں دکھا رہے ہو۔ کہنے لگے حق تعالےٰ کی طلب میں ـــ میں نے کہا کہ میں وہی تو ہوں جس کی تلاش میں تم نکلے ہو۔ وہ یکدم اٹھے اور مجھ سے مصافحہ کرنے لگے۔ (صفحہ ۹۳)

یعنی یہاں یہ صاحب خود خدا ہی بن گئے۔ (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ)

ذاتِ باری تعالےٰ کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ (۶/۱۰۳) کوئی آنکھ اس ذات کا ادراک نہیں کر سکتی۔ حتیٰ کہ جب حضرت موسےٰ ؑ نے خدا کو دیکھنے کی آرزو کا اظہار کیا تو جواب ملا کہ لَنْ تَرَانِي۔ تو مجھے دیکھ نہیں سکتا، لیکن، اس کے باوجود، آپ دیکھیئے کہ ان حضرات کی کیا کیفیت تھی جن کا تذکرہ شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ بعض درویشوں کے بارے میں مجھے تردد تھا کہ حضرت حق تعالےٰ کی بارگاہ میں وہ کیا مرتبہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ میں نے چشم مشاہدہ سے ایک تجلی دیکھی۔ گویا حضرت حق حسین صورت میں متمثل ہو کر برقعہ پوش ہیں۔ میرے اور حضرت حق کے درمیان کچھ فاصلہ ہے۔ جب اس کا جمال پاک مجھ پر ظاہر ہوا تو دل ہاتھ سے چلا اور مجھے اس سے بھی زیادہ قرب کی خواہش پیدا ہوئی۔ وہ میری اس تمنا پر مطلع ہو کر قدرے اور نزدیک ہوا۔ اس پر آتشِ شوق بھڑک اٹھی اور خواہش قرب میں اور اضافہ ہوا۔ اس پر مطلع ہو کر وہ اور نزدیک آگیا ـــــ .... اس مرحلہ پر میں برقعہ کی موجودگی سے تنگ آگیا اور اس کے ہٹانے کی آرزو کی۔ فرمایا، برقعہ تو بہت باریک ہے جو حسن مستور کو اور نمایاں کر رہا ہے ـــ عرض کی، پھر بھی حجاب تو ہے۔ بالآخر نقاب اٹھا دی اور پھر فرمایا کہ بعض سالکوں کو پہلا مرتبہ حاصل ہے۔ خاص سالکین کو دوسرا مرتبہ اور اخص الخواص کو مرتبہ ثالث میسر ہے۔ اور فلاں فلاں ان تینوں میں سے کوئی مرتبہ بھی نہیں رکھتے۔ (صفحہ ۹۴)

ہمارے ہاں تو شخصیت پرستی اس قدر شدت اختیار کر چکی ہے کہ آپ جس شخص کے نام کے ساتھ بھی علیہ الرحمتہ لکھ دیں۔ اس کے متعلق کسی قسم کی تنقید حتیٰ کہ تحقیق بھی ناقابلِ برداشت قرار پا جاتی ہے۔ لیکن مغربی مفکرین نے تصوف اور صوفیاء کے متعلق بڑی نفسیاتی تحقیق کی ہے۔ واضح رہے کہ تصوف (MYSTICISM) مسلمانوں ہی کی خصوصیت نہیں۔ یہ ساری دنیا میں پایا جاتا ہے۔ اور "اولیاء" (SAINTS) کے وجود سے کوئی مذہب و مشرب بھی خالی نہیں۔ خواہ

ان کے نام کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ اس سلسلہ میں زیادہ نہیں تو ولیم جیمز کی مشہور کتاب (VARIETIES OF RELIGIOUS EXPERIENCE) یا (GEORGE GODWIN) کی کتاب (THE GREAT MYSTICS) کا مطالعہ خالی از فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ (گاڈون) ان کے متعلق لکھتا ہے کہ عام طور پر یہ لوگ نفسیاتی پیچیدگیوں کا شکار ہوتے ہیں اور جنسیات کا ان پر خاصہ اثر ہوتا ہے۔ ہم اپنے ان کے کسی صوفی کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ ہاں اتنا واضح کر دینا غیر از محل نہیں سمجھتے کہ طائفہ صوفیاء کے سرخیل شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ اپنے متعلق خود کہتے ہیں کہ جب وہ مکہ میں مقیم تھے تو ایک دوشیزہ کی طرف ان کا میلان ہو گیا تھا اور ان کے اکثر مکاشفات کا روحانی جذبہ اسی کے عشق کا رہین منت ہے (فتوحاتِ مکہ) آپ دیکھئے کہ شاہ ولی اللہؒ اس باب میں کیا فرماتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

> والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ میں انتہائی روحانی گھٹن محسوس کر رہا تھا کہ واقعتہً مجھ پر ایک تجلی وارد ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک حسین و جمیل عورت زیورات اور جاذبِ نظر لباس سے مزین ہے۔ وہ آہستہ آہستہ میرے قریب آنے لگی اور اس کے قرب سے میرا شعلۂ شوق بھڑکنے لگا۔ بالآخر وہ مجھ سے بغل گیر ہو کر یک تن ہو گئی۔ میرا وجود اسی کی شکل میں متشکل ہو گیا اور وہ تمام زیورات اور لباس میں نے اپنے وجود پر موجود پائے۔ یہ دیکھ کر مجھے انتہائی انبساط و سرور حاصل ہوا، اور وہ گھٹن جاتی رہی۔
>
> (صفحہ ۹۴، ۹۵)

ہم اپنے موضوع سے دُور نکل جائیں گے ورنہ ہم بتاتے کہ مرزا غلام احمد قادیانی اس باب میں کہاں تک آگے نکل گئے تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان بزرگوں نے کس طرح یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ خود خدا ہو گئے تھے۔ خدا کے بعد حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس و اعظم ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس سلسلہ میں شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:۔

> کاتب الحروف نے حضرت والد ماجد کی روح کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک کے سائے (ضمن) میں لینے کی کیفیت کے بارے میں دریافت کیا تو فرمانے لگے۔ یوں محسوس ہوتا تھا — گویا میرا وجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود سے مل کر ایک ہو گیا ہے۔ خارج میں میرے وجود کی کوئی الگ حیثیت نہیں تھی۔ بجز اس کے کہ میرا علم مجھے اپنا شعور دلا رہا تھا۔ (صفحہ ۱۰۲)

رسول اللہؐ کے بعد اولیاء کا مقام آتا ہے۔ اِس ضمن میں شاہ صاحبؒ نے اپنے والد ماجد کے متعلق لکھا ہے:۔

> فرمایا کہ ایک بار میں حضرت خواجہ قطب الدینؒ کے مزار مبارک کی زیارت کے لئے گیا۔ یکایک میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ میری گنہگار آنکھیں اور وجود اس قابل نہیں کہ اس مقدس بارگاہ میں حاضری دیں۔ اس خیال کے آتے ہی میں مزار مبارک کے چبوترے پر رُک گیا۔ اسی دوران آپ کی روحانیت جلوہ گر ہوئی اور مجھے حکم دیا کہ آگے آؤ! میں دو تین قدم آگے بڑھا۔ اسی اثناء میں میں نے دیکھا کہ آسمان سے چار فرشتے ایک تخت اٹھائے ہوئے آپ کی قبر مبارک کے قریب اُترے۔ معلوم ہوا کہ اس تخت پر حضرت خواجہ نقشبندؒ بند ہیں۔ قِران السعدین ہوا۔ دونوں شیوخ نے خلوت میں راز و نیاز کی باتیں کیں۔ اس کے بعد حسب سابق فرشتے تخت کو اٹھا کر روانہ ہو گئے۔ (صفحہ ۱۰۹)

شاہ صاحبؒ نے حضراتِ اولیائے کرام کے متعلق اور بھی بہت سے اسی قسم کے واقعات لکھے ہیں۔ لیکن ہم ان کی تفصیل میں نہیں

جانا چاہتے۔ صوفیائے کرام میں ایک گروہ مجذوبوں کا ہوتا ہے ــــ یعنی ایسے لوگ جنہیں آپ نے ننگے دھڑنگے سڑکوں پر بھاگتے یا غلاظت میں لتھڑے ہوئے اور ان گداگروں سے مراد ہیں مانگنے والے عبادت مسجدوں کو بیٹھے اکثر دیکھا ہوگا۔ اسی قسم کے ایک مجذوب کے متعلق شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔

حضرت والد ماجد نے فرمایا کہ سید عبداللہ سنایا کرتے تھے کہ طلب کے ابتدائی ایام میں، میں ایک مجذوب کی خدمت میں پہنچا جو ہمیشہ بازاروں میں ننگا پھرا کرتے تھے۔ جب مجھے دیکھا تو بھاگ کھڑے ہوئے ــــ میں بھی ان کے پیچھے تیز تیز چلنے لگا۔ جب قصبے سے باہر آگئے تو وہاں ایک بڑھیا لکڑیاں جمع کر رہی تھی۔ مجذوب نے اس کا دوپٹہ لے کر تن ڈھانپ لیا اور میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔ السلام علیکم ... پھر کہنے لگا کہ اس وقت میں ننگا تھا اور تم سے حیا آرہی تھی۔ مگر تم نے میرا تعاقب کیوں کیا؟ ــــ عرض کی کہ میں جانتا تھا کہ آپ کی عادت ہی کچھ ایسی ہے۔ فرمانے لگے، قصبے والے جانور ہیں۔ اولئک کالانعام بل ھم اضل (یہ جانور ہیں بلکہ ان سے بھی بدترین راہ پر چلنے والے) اس لئے ان سے پردہ نہیں کرتا۔ مگر جب کوئی اہلِ دل پہنچ جاتا ہے تو پابند ہو جاتا ہوں۔ (صفحہ ۵۰-۵۱)

اکثر بزرگوں کے متعلق یہ مشہور ہوتا ہے کہ بیٹھے بیٹھے ان کا وجود گم ہو جاتا تھا۔ اور کچھ وقت کے بعد وہ پھر اسی طرح نمودار ہو جاتے تھے۔ پوچھنے پر وہ بتاتے تھے کہ (مثلاً) وہ حرم کعبہ میں عصر کی نماز پڑھنے گئے تھے یا ان کے فلاں مرید کی کشتی بھنور میں پھنس گئی تھی۔ اس نے انہیں پکارا تھا۔ یہ وہاں گئے تھے۔ اور اس کی کشتی کو کنارے لگا کر واپس آرہے ہیں۔ اس سلسلہ میں شاہ صاحبؒ اپنے والد بزرگوار کے متعلق لکھتے ہیں:۔

ایک رات درود پڑھ رہا تھا کہ ایک نورانی شبیہ چاند کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ حالانکہ اس رات چاند نمودار نہیں تھا۔ اور آہستہ آہستہ پوری روئے زمین پر پھیلنا شروع ہوئی، اس کے بعد وہ میرے سر اور جسم پر وارد ہوئی۔ جب تک وہ نورانی شبیہ میرے سر سے قدرے پرے تھی تو میں ذوق و شوق سے سرمست ہو رہا تھا۔ جب عین سر پر آئی تو بے ہوش ہو گیا اور بظاہر میرا وجود غائب ہو گیا۔ واللہ اعلم، کیونکہ میرے والد نے مجھے بہت ڈھونڈا، مگر نہ پایا۔ جس کے سبب ان پر اضطراب اور پریشانی چھا گئی۔ اور غیاب اور گم شدگی کی حالت میں میں نے آسمان پر آسمان طے کرنے شروع کئے۔ یہاں تک کہ ان سب کو پار کر گیا، حتیٰ کہ بارگاہ سید الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام میں جا پہنچا۔ جہاں انہوں نے مجھے اپنی بیعت میں قبول فرما کر نفی و اثبات کی تلقین فرمائی۔ تھوڑی دیر بعد مجھے افاقہ ہوا اور اپنی پہلی حالت میں آگیا۔ (صفحہ ۳۸-۳۹)

اپنے والد ماجد کے متعلق شاہ صاحبؒ ایسے واقعات بھی لکھتے ہیں۔ جن میں انہوں نے جانوروں تک سے باتیں کیں مثلاً ایک واقعہ کے ضمن میں لکھتے ہیں:۔

کچھ عرصہ بعد میں اسی محلے کے اسی کوچے سے گزر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ سامنے ایک کتا آرہا ہے اور اس کوچے میں کچھ کیچڑ ہے۔ میرے دل میں آیا، اس جگہ سے جلدی گزر جانا چاہیئے،

ناکہ کتے کے ناپاک چھینٹے کپڑوں پر نہ پڑیں میں تیزی سے بڑھا، مگر کتا مجھ سے بھی زیادہ تیزی سے آگے آیا۔ اسی کیچڑ پر ہم ایک دوسرے کے قریب آ گئے ——— مجھے دیکھ کر وہ کتا ٹھہر گیا۔ اور صاف زبان میں کہنے لگا۔ السلام علیک۔ میں نے وعلیک السلام کہا۔ پھر اس نے کہا۔ تم نے حدیث قدسی میں پڑھا ہے۔ رب العزت فرماتا ہے۔ یا عبادی انی حرمت الظلم علی نفسی و جعلته علیکم محرماً۔ فلا تظالموا۔ (میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کر رکھا ہے۔ اسی طرح تمہارے لئے بھی ظلم حرام ہے۔ پس ظلم نہ کرو۔) مجھ پر تم نے کیوں ظلم کیا ہے۔ (صفحہ ۱۱۸)

اسی قسم کا ایک اور واقعہ ملاحظہ فرمائیے۔

فرمایا۔ رمضان المبارک کے آخری دن (جبکہ عید کے چاند کی توقع ہوتی ہے) میں مسجد جبوط میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک چڑیا آ کر کہنے لگی۔ کل عید ہے۔ میں نے یہ بات حاضرین مجلس سے کہی۔ فرہاد بیگ کہنے لگے، حیوانات کی باتوں کا کیا اعتبار۔ اس پر وہ چڑیا کہنے لگی۔ جھوٹ بنی آدم کا طغرہ ہے ہم اس سے آزاد ہیں۔ پھر وہ اڑ گئی اور اپنی ایک دوسری ہم جنس کو لائی۔ اس نے بھی اس بات کی گواہی دی۔ اس کے بعد جلد ہی قاضی شہر کے سامنے شرعی شہادتیں پیش ہو گئیں کہ عید کا چاند دیکھا گیا ہے۔

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہؒ) نے چڑیوں کی گفتگو کے بارے میں پوچھا۔ فرمانے لگے۔ ان کی آواز اور چوں چوں بھی بالکل دوسری چڑیوں کی طرح تھی۔ مگر لطف ربانی سے میں نے ان کی چوں چوں سے بامعنی مفہوم اخذ کر لیا۔

شیخ فیض اللہ بیان کرتے تھے کہ ایک جنگلی کوا دوسرے تیسرے دن حضرت کی خدمت میں آیا کرتا تھا اور توحید کے بارے میں باتیں پوچھا کرتا تھا۔ کچھ عرصے بعد آپ نے اسے نہ پایا تو راوی (شیخ فیض اللہ) سے پوچھا کہ اکثر یہاں ایک کوا بیٹھا کرتا تھا، جسے میں چند دنوں سے نہیں دیکھ رہا۔ میں نے عرض کیا۔ فلاں شخص نے اسے شکار کر کے اپنے شکاری پرندے کو کھلا دیا ہے۔ آپ نے بہت افسوس کیا ——— رنجیدہ ہوئے اور فرمایا کہ یہ کوا موحد تھا۔ مجھ سے توحید کے بارے میں اکثر سوالات پوچھا کرتا تھا۔ (صفحہ ۱۲۰)

اور جنات تو ان حضرات کے ہاں عام طور پر آتے جاتے رہتے ہیں۔ چنانچہ شاہ صاحبؒ اپنے والد ماجد کے وقائع کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں:۔

فرمایا کہ ایک جن نے مجھ سے بیعت کے اشغال اور اوراد سیکھے۔ ایک دن میں گھوڑے پر سوار جا رہا تھا کہ وہ متشکل ہو کر میرے سامنے آ گیا۔ اور صلوٰۃ التسبیح کے بارے میں پوچھنے لگا۔ میں نے اسے بتایا۔ جہاں میری بات اسے پوری طرح سمجھ میں نہ آتی وہ دوبارہ اسے پوچھتا۔ یہاں تک اچھی طرح سمجھ گیا۔ ایک دن محمد غوث کی چارپائی پر یاں اٹھا کر لے گئیں اور اسے تکلیف پہنچانے لگیں۔ یہی جن وہاں پہنچ گیا اور اس نے پریوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر محمد غوث کو چھڑایا اور اسے

کہا کہ حضرت والد سے سلام کے بعد کہنا کہ یہ یاں نہیں جو تمہیں ایذا پہنچا رہی تھیں۔ میں نے انہیں ڈانٹ کر بھگا دیا ہے۔ (صفحہ ۱۲۱)

لکھنے کو تو ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ لیکن ——— سفینہ چاہیئے اس بحرِ بے کراں کے لئے ——— ہم خود شاہ صاحبؒ کی ولادت کے متعلق ایک واقعہ کو نقل کر کے اس داستان کو ختم کرتے ہیں۔

فقیر (ولی اللہ) ابھی پیدا نہیں ہوا تھا کہ ایک رات حضرت والد ماجد نماز تہجد پڑھ رہے تھے اور میری والدہ بھی ان کے قریب تہجد میں مشغول تھیں۔ نوافل کے بعد حضرت والد نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور والدہ آمین کہتی رہیں۔ اسی اثنا میں دو اور ہاتھ ظاہر ہوئے۔ حضرت والد نے فرمایا۔ یہ دو ہاتھ ہمارے بیٹے کے ہیں جو پیدا ہوگا۔ وہ ہمارے ساتھ دعا مانگ رہا ہے۔ اس کے بعد یہ فقیر پیدا ہوا اور سات سال کی عمر میں نماز تہجد میں والدین کا ساتھی بنا اور اسی خواب والی وضع میں ان دونوں کے درمیان ہاتھ اٹھائے۔ (صفحہ ۱۲۵)

یہ ہے وہ تصوف جسے عین دین ہی نہیں، مغزِ دین بھی کہا جاتا ہے۔ جو واقعات اوپر درج کئے گئے ہیں وہ کسی بھنگڑ خانے میں "سلفے کی لاٹ" سے نکلے ہوئے شعلے نہیں، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمۃ کے جملۂ علوم و معارف سے نکلنے والی مقدس شعاعیں ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے چہار اکناف عالم کو بقعۂ نور بنا رکھا ہے۔ اس پر ہم اس سے زیادہ تبصرہ کچھ نہیں کرنا چاہتے کہ جب ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے یہ کچھ اسلام کے نام سے پیش کیا جائے گا، اور پیش بھی کیا جائے گا محدث دہلویؒ جیسی بلند پایہ شخصیت کی طرف سے تو فرمایئے کہ اس کے بعد ان نوجوانوں کو اسلام کی طرف سے برگشتہ کرنے کے لئے کسی اور چیز کی بھی ضرورت رہے گی؟

اور اس کے بعد صرف اتنا کہ یہ وہ اسلام ہے جسے اب خیر سے خود حکومت کی زیر نگرانی فروغ دیا جا رہا ہے۔ محکمہ اوقاف کا بنیادی مقصد ہی یہ ہے۔

لاہور میں قیام کے لئے
فون ۵۷۲۵۹
پارک وے ہوٹل
PARK WAY
صاف ستھرے ہوادار کمرے مناسب شرح پر
نیز
عمدہ۔ لذیذ اور پسندیدہ کھانوں کیلئے
معیاری طعام گاہ
آپ کی تشریف آوری کا شکریہ
مینیجر پارک ہوٹل نزد ریلوے اسٹیشن لاہور

مرگِ تو اہلِ جہاں را زندگیست!

یہ پرچہ مرتب ہو چکا تھا کہ وہ خبر جسے سننے کے لئے اتنے عرصہ سے کان بیتاب اور جسے پڑھنے کے لئے آنکھیں وقفِ انتظار تھیں، کڑکتی ہوئی بجلی کی طرح فضاؤں کو چیرتی ہوئی، کرۂ ارض پر پھیل گئی۔ جب مجیب الرحمٰن نے ملت سے اس قدر کھلی ہوئی غداری سے اپنے لئے رسوائی کونین کا سامان خریدا تو ہم نے علامہ اقبالؒ کی اس نظم کے حسبِ ذیل اشعار نقل کئے تھے، جسے انہوں نے جعفر اور صادق جیسے غداروں کے حوالہ سے جاوید نامہ میں لکھا ہے ؂

جعفر اندر ہر بدن ملت کش است ۔۔۔ ایں مسلمانے کہن ملت کش است

گاہ او را با کلیسا ساز باز ۔۔۔ گاہ پیشِ دیریاں اندر نیاز

دینِ او، آئینِ او، سوداگری است ۔۔۔ عنتری اندر لباس حیدری است

از نفاقش وحدتِ قومے دونیم ۔۔۔ ملتِ او، از وجودِ او لئیم!

ملتے را ہر کجا غارت گرے است ۔۔۔ اصلِ او از صادقے یا جعفرے است

الاماں از روحِ جعفر، الاماں ۔۔۔ الاماں از جعفرانِ ایں زماں!

اس کا آخری شعر یہ ہے ؂

ایں جہاں لا ابتدا لا انتہا است ۔۔۔ بندۂ غدار را مولا کجا ست

اس کے بعد ہم رو رو کر آسمان کی طرف تکتے تھے اور بار بار کہتے تھے کہ یا الٰہا!

دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

بالآخر وہ روزِ مکافات آ گیا، اور مجیب کے جرائم کی استوار کردہ عمارت خود اپنی چھت کے بوجھ سے نیچے آ گری، جس کے تلے، یہ ملعونِ ازلی کچل کر مر گیا۔ اور مظلوموں نے یہ کہہ کر سکھ کا سانس لیا کہ ـــــــ مرگِ تو اہلِ جہاں را زندگیست۔

مجیب کا یہ انجام، زود یا بدیر ہونا تھا۔ اس میں ہمیں ذرا بھی شبہ نہیں تھا ـــــ فطرت نے کبھی کسی غدار کو نہیں بخشا۔ بات صرف وقت کی تھی۔ یہ وقت ہمارے اندازے سے بھی بہت پہلے آ گیا۔ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ (۶/۴۵) ظالم کی جڑ کٹ گئی۔ فالحمد للہ۔ خبر میں بتایا گیا ہے کہ مجیب کو اس کے گھر میں گولی کا نشانہ بنا کر ہلاک کر دیا گیا۔ ٹھیک ہے۔ انسانی ضابطہ میں

موت سے بڑھ کر کوئی سزا نہیں ہو سکتی۔ وہ انہیں مل گئی۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ کوئی ایسا طریق تجویز کیا جائے جس سے آنے والی نسلوں کو یاد رہے کہ غدار کا انجام کیا ہوا کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم نے ۱۹۷۱ء میں ایک تجویز پیش کی تھی جسے دہرا دینے کا یہ مناسب ترین موقعہ ہے۔ ہم نے لکھا تھا کہ مکہ سے طائف کو جاتے ہوئے راستہ میں، مغمس کے مقام پر ایک قبر ہے۔ ہر عرب جو وہاں سے گذرتا ہے اس قبر پر کنکریاں مار کر گزرتا ہے۔ یہ قبر کس کی ہے اور اس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا جاتا ہے؟ یہ بات سننے کے قابل ہے۔ قرآن کریم میں سورۃ الفیل میں، ہاتھیوں والے کی مہم کا ذکر ہے۔ یہ ہاتھیوں والا، یمن کا گورنر ابرہہ تھا۔ اس نے مکہ پر چڑھائی کی تو پہاڑیوں کے پیچھے سے ایک ایسا خفیہ راستہ اختیار کیا جس کا علم عربوں کے سوا کسی کو نہ تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مکہ پر اچانک حملہ بول دیا جائے۔ اس نے تو ایسی احتیاط برتی، لیکن فطرت کے جاسوسوں، گدھوں چیلوں نے اس کا راز فاش کر دیا۔ ان پرندوں کو جبلی طور پر معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ لشکر جو کہیں جا رہا ہے تو اس کے ساتھ ضرور ہو لینا چاہیئے۔ کیونکہ اس سے انہیں بہت سی خوراک مل جائے گی۔ چنانچہ یہ اوپر سے منڈلاتے ہوئے ساتھ ہو لئے۔ تو اہل مکہ نے بھانپ لیا کہ نیچے کوئی لشکر آ رہا ہے۔ وہ پہاڑیوں پر چڑھے اور اوپر سے بڑے بڑے پتھر اس طرح لڑھکائے کہ ابرہہ اور اس کے لشکر کا بھرکس نکل گیا۔ اہل مکہ کو، اس کی مہم ناکام بنا دینے کے بعد، اس بات کی پرچول ہوئی کہ یہ خفیہ راستہ اسے کس نے بتایا تھا۔ تفتیش کے بعد، انہیں پتہ چلا کہ ان میں ایک غدار ابو رغال ثقفی تھا جس نے اس لشکر کی راہ نمائی کی تھی۔ یہ قبر اسی کی ہے جس پر آج تک ہر عرب پتھر مار کر گزرتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ انہوں نے باقی تین غداروں کو پکڑ کر سنگسار کر دیا تھا۔ یہ واقعہ تو ایک دن میں گزر گیا لیکن انہوں نے ضروری سمجھا کہ آنے والی نسلوں کو بھی معلوم ہوتا رہے کہ غداران قوم کا حشر کیا ہوتا ہے، چنانچہ انہوں نے ان کے سنگساری کے مقام پر پتھر گاڑ کر نشانات بنا دیئے اور یہ قومی شعار بنا لیا کہ حج کی تقریب پر، ان غداروں کی یادگاروں پر پتھر مارے جائیں۔ یہ جو حج کے موقعہ پر "تین شیاطین" کو کنکریاں ماری جاتی ہیں تو کہا جاتا ہے کہ یہ اسی واقعہ کی یادگار ہے۔

کوئی اس قسم کی یادگار دورِ حاضر کے اس "ابو رغال ثقفی" کی بھی قائم کرنی چاہیئے۔

اس خبر میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اس مملکت کا نام "عوامی جمہوریہ بنگلہ دیش" سے تبدیل کر کے "اسلامی جمہوریہ بنگلہ دیش" رکھا گیا ہے۔ ہم نے اس اہم تبدیلی پر بھی تبصرہ کیا تھا لیکن بعد میں کچھ متضاد سی خبریں آنی شروع ہو گئیں جن کی وجہ سے پہلی خبر مشکوک ہو گئی۔ اس وقت پرچہ طباعت کے مرحلہ تک پہنچ چکا تھا۔ لیکن ہم نے مناسب سمجھا کہ جب تک اس خبر کی سرکاری طور پر توثیق نہ ہو جائے، اس پر کوئی تبصرہ نہ کیا جائے۔ چنانچہ پرچے کو پریس سے واپس منگا کر اس تبصرہ کو حذف کر دیا گیا ہے۔ قارئین کو اب اس کے لئے آئندہ ماہ تک انتظار کرنا ہوگا۔

ایک ماہنامہ کی یہی تو دشواری ہوتی ہے۔

"اسلام اور نظامِ جاگیرداری و زمینداری"

روزنامہ "پاکستان ٹائمز" لاہور کی اشاعت بابت ۳ اگست ۱۹۷۵ء میں "زینبوہ" کے قلم سے ایک مقالہ شائع ہوا جس میں انہوں نے ضمناً یہ لکھا کہ حال ہی میں محکمۂ اوقاف، حکومتِ پنجاب کی علماء اکیڈمی کی طرف سے، اکیڈمی کے ڈائریکٹر مسٹر محمد یوسف گورایہ کے زیرِ اہتمام، مولانا سید مناظر احسن گیلانی (مرحوم) کی ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے — اسلام اور نظامِ جاگیرداری و زمینداری — ہم مولانا گیلانی مرحوم کے معاشیات سے متعلق خیالات سے واقف ہیں۔ اس لئے ہم نے اس کتاب کو بڑے اشتیاق سے منگایا۔ کتاب متوسط تقطیع کے قریب سو صفحات پر مشتمل ہے اور مجلد۔ قیمت چار روپے ہے۔ کتاب کا پیش لفظ حسب ذیل ہے۔

"مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم نے "اسلام اور نظامِ زمینداری و جاگیرداری" کے موضوع پر ایک ٹھوس اور مدلل مقالہ سپردِ قلم کیا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے جناب مولانا ابوالخیر مودودی صاحب نے یہ مسودہ جناب ملک معراج خالد صاحب سابق وزیرِ اعلیٰ و حال وفاقی وزیرِ قانون و پارلیمانی امور حکومتِ پاکستان کو برائے اشاعت عنایت کیا تھا۔ مولانا صاحب کا منشاء یہ تھا کہ آج کے حالات میں، جبکہ ہمارا معاشرہ ہر لحظہ تغیر پذیر ہے، اور لوگوں کو، انفرادی اور اجتماعی سطح پر، گوناگوں اقتصادی و معاشی مشکلات کا سامنا ہے اور جبکہ زمینداری اور جاگیرداری کا موجودہ استحصالی نظام شدت کے ساتھ زیرِ بحث ہے۔ اس مسودہ کی اشاعت ایک علمی و فکری راہنمائی کا باعث بن سکے گی۔

اس خیال کے پیشِ نظر محترم ملک صاحب نے یہ مسودہ ازراہ کرم محکمۂ اوقاف، پنجاب کے سپرد کیا۔ ہم نے مسودہ کو بغور پڑھا۔ اس کے مندرجات کا جائزہ لیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ مولانا گیلانی مرحوم کی یہ تحریر اگرچہ مختصر ہے اور حالیہ وقت کی تحریر نہیں ہے مگر اس کی افادیت مسلّم ہے اور پورے طور پر موجودہ حالات میں دینی، علمی اور فکری راہنمائی کا ذریعہ۔"

اس تعارف کے ساتھ یہ کتاب شائع ہوئی ہے۔ ہم نے جب متن کتاب کو پڑھنا شروع کیا تو ذہن نے ملول محسوس کیا کہ ہم نے یہ کچھ کہیں پہلے پڑھا ہوا ہے۔ حافظہ پر زور دینے سے حقیقت سامنے آگئی۔ مولانا گیلانی مرحوم کا ایک مقالہ، جس کا عنوان تھا "کیا اسلام میں نظامِ جاگیرداری و زمینداری کی گنجائش ہے؟" مجلّہ "معارف" اعظم گڑھ کی دسمبر ۱۹۵۲ء اور جنوری ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا اور اس کے بعد اُسے طلوعِ اسلام نے اپنی اشاعت بابت مئی و جون ۱۹۵۳ء میں، دو اقساط میں شائع کیا۔ یہ کتاب من و عن وہی مقالہ ہے، جو طلوعِ اسلام میں شائع ہوا تھا۔ اس کے باوجود کتاب کی پیشانی پر "حقوقِ طبع محفوظ ہیں" لکھا ہے۔

یہ تو ہو سکتا ہے کہ مولانا ابوالخیر مودودی صاحب کے علم میں یہ بات نہ ہو کہ یہ مقالہ "معارف" یا "طلوعِ اسلام"

بقیہ — حیاتِ قائدِ اعظمؒ — (ص [illegible] سے آگے)

زمانہ ہندو مسلم اتحاد کی اس شہادت روزِ جد و جہد پر قربان ہو گیا۔ لیکن لندن کانفرنس نے حقیقتِ حال کے تمام گوشے بے نقاب کر کے رکھ دیئے۔ ان کے دل و دماغ اور فکر و بصیرت نے برملا شہادت دی کہ ہندو مسلم اتحاد ایک سراب ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ ایک سہانا خواب ہے جس کی تعبیر ہمیشہ گھناؤنی اور دل خراش ثابت ہوئی۔ یہ ان کی زندگی کا آخری تجربہ تھا۔ ان کے قدموں نے اس راہ میں مزید ایک قدم آگے بڑھنے سے بھی انکار کر دیا۔

لندن کانفرنس کے خاتمے کے ساتھ قائدِ اعظمؒ کی "تحریک استخلاصِ ہند" کی جد و جہد کا پہلا باب اختتام پذیر ہوتا ہے۔ چار سال بعد وہ ایک نیا عزم لے کر میدان میں آتے ہیں۔ اور اپنی اور صرف اپنی ملت کو لے کر آگے بڑھتے ہیں۔ لیکن اس میں بھی انہوں نے کوئی قدم ایسا نہیں اٹھایا جس میں ہندوؤں سے بے انصافی یا انتقام کی خفیف سی جھلک پائی جاتی ہو۔ "ہندو مسلم اتحاد" اب بھی ان کے پیشِ نظر تھا۔ لیکن یہ وہ اتحاد تھا جو دو برابر کی ہمسایہ مملکتوں میں ہوتا ہے۔ یہی اتحاد درحقیقت پائیدار ثابت ہو سکتا تھا۔ دوسرے یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے اپنی اس نئی تحریک میں کسی ایسی چیز کو ابھرنے نہیں دیا جس سے ہندوستان کی آزادی کی تحریک کو ٹھیس لگے یا جس سے انگریز فائدہ اٹھا کر ہندوستان کی غلامی کی رسیوں کو کس دے۔ ان کی یہ نئی تحریک ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لئے آزادی اور استقلال کی واضح نشان دہی تھی۔ اور تاریخ نے اس پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ برطانوی سامراج کے خلاف ان کی یہ نئی منزل "تحریک استقلالِ پاکستان" کی منزل ہے۔ یہاں سے ان کی جد و جہد کا وہ نیا باب شروع ہوتا ہے جو حصولِ پاکستان کی فتحِ عظیم سے حاصل تکمیل کو پہنچتا ہے۔ ہم نے حکومتِ برطانیہ کے خلاف ان کے جہادِ آزادی کا ایک باب قارئین کے سامنے پیش کر دیا۔ اس کا دوسرا باب تحریکِ پاکستان کے ضمن میں سامنے آئے گا۔

اس اشاعت میں ہم نے جو کچھ پیش کیا ہے اس کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ قائدِ اعظمؒ پر انگریز نوازی، اور رجعت پسندی کے جو وہ الزامات مخالف کیمپ کی طرف سے عائد کئے جاتے ہیں ان کی حقیقت کیا ہے۔ تحریکِ پاکستان کے تذکرہ میں یہ حقیقت مزید نکھر کر سامنے آئے گی اور اس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ انہوں نے سیاسی جد و جہد میں جو راہ بھی اختیار کی اس کا مقصد ...... بہر نوع اس برصغیر کو غیر ملکی سامراج کے بندھنوں سے نجات دلانا تھا۔ تاریخ کی یہ وہ درخشندہ اور ناقابلِ تردید حقیقت ہے جس کی شہادت قائدِ اعظمؒ کے انصاف پسند سیاسی حریفوں نے بھی دی ہے۔ حالانکہ انہوں نے انتہائی صاف اور واشگاف انداز میں مسٹر گوکھلے کی اس پیشین گوئی کو سچ ثابت کر دیا کہ،

ہندوستان کو جب بھی آزادی نصیب ہوئی وہ جناح ہی کی بدولت ہو گی۔

(باقی دارد)

اہم کتابوں کے نئے ایڈیشن

کتاب التقدیر

پرویز صاحب کی اس گرانقدر تصنیف کے تعارف کی ضرورت نہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن جس طرح اربابِ فکر و نظر نے ہاتھوں ہاتھ لیا، اور اس کے بعد ان کی طرف سے جو آراء موصول ہوئیں۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یہ کتاب کس قدر مقبول ہوئی ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہونے پر اربابِ ذوق کو مایوس ہونا پڑا تھا۔ اب اسی حسن و زیبائی سے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا گیا ہے۔ عمدہ سفید کاغذ، پائیدار جلد، دیدہ زیب گرد پوش۔ قیمت تیس روپے۔ علاوہ محصول ڈاک۔

جہانِ فردا

مفکرِ قرآن کی یہ مایۂ ناز تصنیف اُخروی زندگی کے متعلق ہے جو ہمارے ایمان کا بنیادی جزو ہے۔ حیات بعد الممات، حشر، نشر، حساب، نتائج الاعمال، جنت، جہنم، ان تمام مابعد الطبیعیاتی قرآنی تفصیلات کو انتہائی غور و فکر کے بعد واضح اور دلنشیں انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ایک عرصہ سے نایاب ہو گئی تھی اور اہلِ نظر کے تقاضوں پر تقاضے موصول ہو رہے تھے۔ للہ الحمد کہ یہ اسی آب و تاب کے ساتھ دوبارہ شائع ہو گئی ہے۔ سفید کاغذ، مضبوط جلد، دیدہ زیب گرد پوش، قیمت پچیس روپے۔ علاوہ محصول ڈاک۔

اقبال اور قرآن

قرآنی روشنی کے بغیر علامہ اقبالؒ کی فکر اور پیام سمجھ میں آ ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ انہوں نے خود کہا ہے کہ میری فکر کا سرچشمہ خدا کی یہ کتاب عظیم ہے۔ پرویز صاحب جس انداز سے اقبالؒ کے پیغام کی قرآنی روشنی میں تشریح کرتے ہیں اس کی مثال دوسری جگہ نہ مل سکے گی۔ انہوں نے گذشتہ قریب پچاس برس میں حضرتِ علامہ کے متعلق جو خطابات پیش کئے وہ ملت کی گراں قدر متاع ہے۔ اسی متاع کو اس کتاب کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ جو بڑی تقطیع کے تقریباً ۴۰۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ سفید کاغذ، روشن طباعت، عمدہ جلد، جاذبِ نگاہ گرد پوش۔ قیمت پچیس روپے۔ علاوہ محصول ڈاک۔

ملنے کے پتے

ادارۂ طلوعِ اسلام
۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور

مکتبۂ دین و دانش
چوک اردو بازار۔ لاہور

اسلام کو علم و بصیرت کی روشنی میں سمجھنے کے لئے سودمند ترین

انقلاب انگیز کتابیں

انسان نے کیا سوچا؟

کیا تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت کرسکتی ہے؟ اس اہم اور پیچیدہ سوال کا جواب یونان کے فلاسفروں سے لے کر ہمارے زمانے کے مفکرین اور سائنسدانوں نے کیا دیا ہے؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے مستغنی کر دے گی۔ بڑی تقطیع۔ خوبصورت ٹائپ۔

عمدہ سفید کاغذ۔ قیمت مجلد بیس روپے

سلیم کے نام خطوط

ہمارا تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ ایک عجیب کشمکش میں گرفتار ہے اسلام کے متعلق اس کے دل میں سینکڑوں شکوک اور شبہات پیدا ہوتے ہیں لیکن اسے ان کا کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ جب وہ اس طرح مذہب سے متنفر ہو جاتا ہے تو ہم اسے کوسنے لگ جاتے ہیں۔ اسے کوسئے نہیں۔ یہ کتاب دیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ کس طرح صحیح اسلام کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ خطوط کا انداز بڑا دلکش اور ہلکا پھلکا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ کاغذ۔ مجلد۔

تین جلدیں۔ قیمت فی جلد۔ بارہ روپے۔

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی معروف ڈکشنری نہیں۔ یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے جس کی تعلیم کیا ہے۔ اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ

چار جلدیں۔ قیمت فی جلد بیس روپے

عہد آفریں کتابیں

بصیرت افروز کتابیں

جہان فردا

مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ زندگی کن مراحل سے گزرے گی؟ قیامت۔ حشر نشر۔ میزان۔ جنت۔ جہنم کا قرآنی مفہوم کیا ہے؟ اس دنیا کا اس دنیا کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ مُردوں کے لئے ایصال ثواب کی حقیقت کیا ہے؟ یہ اور اسی قسم کے دیگر متعدد سوالات کے بصیرت افروز جوابات۔

قیمت مجلد۔ پچیس روپے

اسلام کیا ہے؟

یہ اسلام کی کتاب ہے۔ یہ آپ کو بتاتی ہے کہ بنیادی مسائل کی کتاب ہے۔ یہ کس قسم کا معاشرتی نظام اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں۔ اس کی رو سے انسانی زندگی کی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس میں معاشرہ کی صورت کیا ہے۔ اس کی غرض و غایت کیا ہے۔ اعلیٰ ایڈیشن۔ چند روپے صحیح مقام کیا ہے۔ قیمت آٹھ روپے

سادہ ایڈیشن۔

معلومات افزا کتابیں

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور ◎ مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور